تہذیب اور جمہوریت کا مطالعہ

تہذیبوں کا مطالعہ

برطانوی مؤرخ آرنلڈ جے ٹائن بی (Arnold J. Toynbee) دنیا کا سب سے بڑا تاریخ دان تسلیم کیا جاتا ہے جس کی کتاب اے سٹڈی آف ہسٹری (A Study of History) نے گبن (Gibbon) کی کتاب دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر (The Decline and Fall of the Roman Empire) اور سپنگلر (Spengler) کی کتاب ڈیکلائن آف دی ویسٹ (Decline of the West) سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

انسانی تاریخ کی یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے جسے لکھنے میں 30 سال صرف ہوئے۔ ایک امریکی ڈی سی سمرویل (D.C. Somervell) نے اس کتاب کو دو جلدوں میں تلخیص کر دیا۔ گو اس نے اصل کتاب کو 1/5 حصہ میں تلخیص کیا مگر کمال مہارت سے ٹائن بی کے اصل الفاظ اور طریقے کار کو قائم رکھا۔ ٹائن بی نے 1920ء کی دہائی میں یہ کتاب لکھنا شروع کی اور 1953ء 1955ء میں ختم کی۔

ڈی سی سمرویل (D.C.Somervell) کی دو جلدیں دوسری مرتبہ یونیورسٹی پریس نیویارک اینڈ لندن نے 1965ء میں شائع کیں۔ جب تک دنیا کا جغرافیہ' تاریخ' معاشیات' سیاسیات اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ نہ کیا ہو اس کتاب کو سمجھنا مشکل ہے۔

ٹائن بی نے انسانی تاریخ کی تحقیق میں ابتداً ایک ایسے قابل فہم تاریخی یونٹ (Intelligible Unit of History) کو تلاش کیا جس کی تاریخ شروع سے آخر تک لکھ سکے۔ اس قابل فہم تاریخی یونٹ (Intelligible Unit of History) کے تمام سیاسی' معاشرتی' معاشی' جغرافیائی' روایتی' نسلی' لسانی اور مذہبی پہلوؤں کا تجزیہ کیا جا سکے۔

بادشاہوں کی تاریخ تو بادشاہوں کی کہانی تھی لوگوں کی نہیں۔ انسانی تاریخ کو جغرافیائی حصوں میں بانٹ کر اس کا تجزیہ کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ بادشاہوں' مذاہب اور ثقافتوں کی حدود قدرتی جغرافیائی حدوں سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ انسانی تاریخ کو لسانی بنیاد پر تقسیم کر کے تجزیہ کرنا بھی قدرے مشکل تھا کیونکہ زبان تقریباً ہر سو میل کے فاصلے کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسانی تاریخ کو موجودہ قومیتوں میں بانٹ کر ان کا تجزیہ کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر مملکت کی حدود درجنوں مرتبہ گھٹتی بڑھتی رہی ہیں۔ مثلاً تاریخی طور پر یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ ایک علاقہ کئی بار کئی ملکوں کے قبضہ میں آتا اور جاتا رہا۔ ٹائن بی اپنے ملک برطانیہ کی مثال دیتا ہے کہ جو اس وقت کچھ جزیروں تک محدود ہے کسی وقت یہ ملک تمام یورپ پر پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً ایک صدی تو اس کی مملکت تمام دنیا پر پھیلی ہوئی تھی جس میں مختلف لوگ' مذاہب اور تمدن شامل تھے۔ الغرض اس کو قابل فہم تاریخی یونٹ (Intelligible Unit of History) نہ مل سکا۔ وہ تحریر کرتا ہے کہ اگر عظیم برطانیہ قابل فہم تاریخی یونٹ (Intelligible Unit of History) نہیں ہو سکتا تو دنیا کا کوئی ملک بھی اس ضرورت پر پورا نہیں اتر سکتا۔

اس طرح اس نے عظیم برطانیہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کا تجزیہ کیا۔

تجزیہ کے لئے وہ برطانیہ کی تاریخ کو موجودہ دور سے شروع کر کے اوائل کی تاریخ کی طرف لے گیا۔ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام.....تو'' تاریخی ادوار مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) صنعتوں کا معاشی نظام (اٹھارہویں صدی کی آخری چوتھائی سے شروع ہوا)

(2) جمہوری پارلیمانی سسٹم (سترہویں صدی کی آخری چوتھائی سے شروع ہوا)

(3) مختلف براعظموں پر حکومت کا قیام (سولہویں صدی کی تیسری چوتھائی میں سمندری قزاقوں سے شروع ہوا اور بیرونی تجارت کی صورت میں دنیا پر پھیل گیا اور اس کے علاقے بڑھتے چلے گئے)

(4) تعمیر نو (سولہویں صدی کی دوسری دہائی سے شروع ہوا)

(5) نشاۃ ثانیہ (پندرہویں صدی کی آخری دہائی سے شروع ہوا)

(6) جاگیرداری نظام کا قیام (گیارہویں صدی سے شروع ہوا)

(7) انگریز کا پرانے ادیان کو چھوڑ کر مغربی عیسائیت کو قبول کرنا (چھٹی صدی کے اواخر میں اس کی ابتداء ہوئی)

ٹائن بی نے تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے دیکھا کہ جو عوامل عمل پذیر ہیں وہ برطانوی قوم تک محدود نہیں بلکہ ان کی وجوہات بہت وسیع ہیں جو ہر جز پر اثر انداز ہیں اور جب تک ان اسباب کا کُلی طور پر جائزہ نہ لیا جائے یہ جزوی طور پر سمجھ نہیں آتے لہٰذا ان کا پورے یورپی معاشرے پر اثر انداز ہونے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ٹائن بی کے نزدیک برطانیہ ایک جز ہے ایک بہت بڑے کُل کا جسے وہ ایک ''تہذیب'' یا ''سوسائٹی'' قرار دیتا ہے جسے وہ مغربی عیسائی تہذیب (Western Christendom) قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ اس نے دریافت کیا کہ صرف سوسائٹی (Society) یا تہذیب (Civilization) ایک قابل فہم تاریخی یونٹ (Intelligible Unit of History) بنتی ہے۔ اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ اس تہذیب کی ابتداء 700 عیسوی میں یورپ میں ہوئی اور اس تہذیب کی پیدائش کا تعلق پہلے سے موجود ایک تہذیب سے تھا جسے وہ ہیلنک (Hellenic) اور گریکو رومن سوسائٹی (Greeco-Roman Society) کا نام دیتا ہے۔ اس سوسائٹی کا آغاز آتھین

جزیروں (Aegean Islands) میں 1100 ق م سے پہلے ہوا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغربی عیسائی تہذیب (Western Chirstendom) کے علاوہ اور بھی تہذیبیں موجود ہیں جو کہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ خاص طور پر تہذیب وتمدن میں اس طرح وہ لکھتا ہے کہ یقینی طور پر اس وقت دنیا کے اندر کم وبیش چار اور زندہ تہذیبیں موجود ہیں۔ یعنی اس وقت دنیا میں پانچ تہذیبیں موجود ہیں۔

1۔ مغربی عیسائی تہذیب (Western Christendom) یورپ اور امریکہ کا علاقہ

2۔ آرتھوڈوکس عیسائی تہذیب (Orthodox Christian Society)

جنوبی مشرقی یورپ اور روس کا علاقہ۔ اب یہ مغربی عیسائی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے اور دونوں کے مجموعہ کو مغربی تہذیب (Western Civilization) کہتے ہیں۔

3۔ اسلامی تہذیب (Islamic Civilization) پورا شمالی افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، بحرالکاہل سے لے کر دیوارِ چین تک اور نیچے انڈونیشیا تک کا علاقہ۔ اس کی دو شاخیں ہیں۔ عرب اور فارس

4۔ ہندو سوسائٹی (Hindu Society) برصغیر کا علاقہ

5۔ مشرق بعید تہذیب (Far Eastern Society) وسط ایشیا کے اختتام سے یعنی منگولیا، چین کوریا، جاپان اور بحرالکاہل (Pacific Ocean) تک کا علاقہ

ٹائن بی کہتا ہے کہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر ہم پچھلے ادوار کا جائزہ لیں اور 775 بعد از وفات مسیح کا وقت دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی تہذیبیں اس وقت دنیا کے نقشہ پر موجود تھیں جیسا کہ آج موجودہ دور میں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ معاشروں (Societies) سے ہم کیا سمجھتے ہیں۔

ٹائن بی لکھتا ہے کہ معاشرہ (Society) افراد کی سرگرمیوں کا ایک مشترکہ میدان ہے۔ ایک معاشرے کے رہنے والے افراد کی انفرادی اعمالی قوتیں، ایک معاشرے کی وہ ناگزیر اور اہم اعمالی قوتیں ہیں جن کے اثر پذیر ہونے سے اس تہذیب کی تاریخ بنتی ہے یہاں تک کہ افرادی اعمال یہ بھی تعین کرتے ہیں کہ اس تہذیب نے کب تک زندہ رہنا ہے۔

غرضیکہ قابل فہم تاریخی یونٹ (Intelligible Unit of History) نہ تو قومیت پر مبنی کوئی ملک ہے اور نہ ہی کوئی پوری انسانیت ہے بلکہ انسانوں کی سب سے بڑی گروہ بندی ہے جسے ہم نے ایک تہذیب کہا ہے۔

یہ تحقیق کرتے ہوئے کہ وہ کیا حالات تھے جس میں مغربی عیسائی تہذیب وقوع پذیر ہوئی ہم ایک اور تہذیب کے جائے مرگ پر پہنچتے ہیں جس سے مغربی عیسائی تہذیب نے جنم لیا یا بہتر الفاظ میں مغربی تہذیب اس سے مربوط ہے۔ اس طریقہ سے جب دوسری چار موجودہ تہذیبوں کی تاریخ کا تجزیہ کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ہر تہذیب پچھلی تہذیب سے منسلک تھی جو اب مٹ چکی ہیں۔ اس طرح اسے ایک موروثی تہذیب کہا جاتا ہے۔ ٹائن بی کہتا ہے کہ مجھے اسلامی تہذیب کی تحقیق میں معلوم ہوا کہ اسلامی تہذیب نے نہ تو کسی موروثی تہذیب سے جنم لیا اور نہ وہ کسی گذشتہ تہذیب سے منسلک تھی۔ مزید برآں اس نے یہ کہا کہ اگرچہ اسلام سنی اور شیعہ فرقوں میں بٹ گیا جیسا کہ عیسائی کیتھولک اور آرتھوڈوکس گرجاؤں میں تقسیم ہو گیا لیکن اسلام میں سنی شیعہ کی تقسیم نہ تو اتنی سخت تھی اور نہ ہی تاریخی نتائج کے لحاظ سے اتنی سنگین تھی جتنی کیتھولک اور آرتھوڈوکس گرجاؤں کی تھی۔ اس کے بعد ٹائن بھی ان تہذیبوں کا ذکر کرتا ہے جو آج تک دنیا میں آچکی ہیں۔ مختصر طور پر وہ یہ ہیں۔

1۔ مصری تہذیب (Egyptiac Civilization) ابتدائی تہذیب جس نے کسی تہذیب سے جنم نہیں لیا۔ 4000 ق م دریائے نیل کے علاقہ میں ظہور پذیر ہوئی۔

2۔ اینڈین (Andean) ابتدائی تہذیب تھی جس نے کسی تہذیب سے جنم نہیں لیا۔ اینڈین ساحل پر ابتدائی عیسوی دور میں جنم لیا۔ یہ جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل پر پھیلی ہوئی تھی۔

3۔ منوعن تہذیب (Minoan) ابتدائی تہذیب جس نے کسی تہذیب سے جنم نہیں لیا۔ اس سے ہیلنک اور سارنک (Hellenic and Syriac) تہذیبوں نے جنم لیا۔ اس نے Aegean جزائر میں 8000 ق م جنم لیا۔ یہ یونان اور ترکی کے قریبی سمندر میں پھیلے ہوئے جزائر کا علاقہ ہے۔

4۔ سنتک تہذیب (Sinic) ابتدائی تہذیب تھی مشرقی بعید (Far Eastern) نے اس تہذیب سے جنم لیا۔ سنتک تہذیب نے کسی تہذیب سے جنم نہیں لیا۔ اس نے چین میں 1500 ق م دریائے زرد (Yellow River) کی وادی میں جنم لیا۔

5۔ سومیرک (Sumeric) ابتدائی تہذیب تھی۔ اس تہذیب کا بھی یہ خاصہ ہے کہ اس نے کسی تہذیب سے جنم نہیں لیا جب کہ بیلونک (Babylonci) اور ہٹائٹ (Hittite) تہذیبوں نے اس سے جنم لیا۔ اس نے دریائے فرات (Lower Tigris Euphrates Valley) کی وادی میں 3500 ق م جنم لیا۔

6۔ میعن (Mayan) تہذیب، یہ تہذیب بھی کسی پچھلی تہذیب کی مرہون منت نہیں اس سے یوکیٹک (Yucatic) اور میکسک (Mexic) تہذیبوں نے وسطی امریکہ کے جنگلوں میں 500 ق م جنم لیا۔

7-8۔ یوکیٹک اور میکسک (Yucatic and Mexic) تہذیبیں دونوں کی ابتداء معین (Mayan) تہذیب سے یوکیٹک (Yucatic) علاقہ میں 629 (بعد از وفات) ہوئی۔

9۔ ہٹائٹ (Hittite) تہذیب، سومیرک (Sumeric) تہذیب سے معرض وجود میں آئی لیکن اس کا مذہب سومیرک (Sumeric) نہیں تھا۔ اس کی ابتداء شام سے اوپر کے علاقہ Cappadocia میں ہوئی۔

10۔ شامی (Syriac) تہذیب، یہ تہذیب منوعن (Minoan) تہذیب سے منسلک تھی اس سے ایرانی اور عربی تہذیبیں منسلک ہوئیں 1100 ق م شام کے علاقہ میں جنم لیا۔

11۔ بیبلونک (Babylonic) تہذیب' یہ تہذیب سومیرک (Sumeric) تہذیب سے قریبی طور پر منسلک تھی 1500 ق م عراق میں جنم لیا۔

12-13۔ ایرانی' عربی (Iranian, Arabic) اسلامی تہذیب (Islamic Civilization) یہ تہذیبیں اسلامی تہذیب میں ضم ہوگئیں۔ یہ دونوں تہذیبیں شامی (Syriac) تہذیب سے منسلک تھیں اور 1516 (بعداز وفات) اسلامی تہذیب میں ضم ہوگئیں۔ ایرانی تہذیب کا علاقہ اناطولیہ' ایران اور دریائے اوکسس (Oxus River) تھا جبکہ عربی تہذیب کا علاقہ عرب' عراق' شام اور شمالی افریقہ تھا۔ ان تہذیبوں کی ابتداء 1300 (قبل مسیح) ہوئی۔

14۔ مشرقِ بعید (Far Eastern-Mainbody) اس تہذیب کا بڑا حصہ سنتک (Sinic) تہذیب سے منسلک ہے اس کی ایک شاخ جاپان میں ہے جس کی ابتداء 500 (بعداز وفات) سے قبل چین میں ہوئی۔

15۔ مشرقِ بعید (Far Easten Japanese Offshoot) جاپانی شاخ یہ مشرقی بعید (Far Eastern) مین باڈی تہذیب کی شاخ ہے۔ اس کی ابتداء 500 (بعداز وفات) کے بعد جاپانی آرچی پلاگو (Japanese Archiplago) میں ہوئی۔

16۔ انڈک (Indic) تہذیب' یہ ابتدائی تہذیب تھی اس سے ہندو تہذیب نے جنم لیا۔ اس کی ابتداء دریائے سندھ اور گنگا کی وادیوں میں 1500 ق م میں ہوئی۔

17۔ ہندو (Hindu) تہذیب نے انڈک (Indic) تہذیب سے 800 (بعداز وفات) سے قبل شمالی ہندوستان میں جنم لیا۔

18۔ ہیلنک (Hellenic) تہذیب' منوعن (Minoan) تہذیب سے منسلک تھی لیکن زیادہ قریب بھی نہیں تھی۔ اس سے مغربی عیسائیت (Western Christendom) اور آرتھوڈکس عیسائیت (Orthodox Christendom) یعنی مغربی تہذیب نے جنم لیا۔ اس تہذیب نے Aegean جزائر اور ساحلوں میں 1100 ق م جنم لیا۔

19۔ آرتھوڈوکس عیسائیت (Orthodox Christian Mainbody) ہیلنک (Hellenic) تہذیب سے منسلک ہے اس کی ایک شاخ روس میں ہے۔ اس کی ابتداء 700 (بعداز وفات) اناطولیہ میں ہوئی۔

20۔ آرتھوڈوکس عیسائیت روسی شاخ (Orthodox Christian Russian Offshoot) یہ آرتھوڈوکس عیسائیت مین بوڈی (Orthodox Christian Mainbody) کی ایک شاخ ہے اس کی ابتداء روس میں 1000 (بعداز وفات) ہوئی۔

21۔ مغربی عیسائیت (Western Christendom) تہذیب ہیلنک (Hellenic) تہذیب سے مغربی یورپ میں 1700 (بعداز وفات) قبل جنم لیا۔

ٹائن بی لکھتا ہے کہ ان اکیس تہذیبوں میں سے سولہ تہذیبیں ختم ہوچکی ہیں اور وہ پانچ تہذیبیں جن کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے قائم ہیں۔

اگلا سوال یہ تھا کہ تہذیبیں کیسے جنم لیتی ہیں اور کیسے پھل پھول کر قائم ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں؟

ان اکیس تہذیبوں میں سے چھ تہذیبیں انسان کی ابتدائی زندگی کے بعد وجود میں آئیں اور پندرہ تہذیبوں نے کسی نہ کسی پچھلی تہذیب سے جنم لیا ماسوائے اسلامی تہذیب کے۔

عام طور پر یہ نظریہ رکھا جاتا تھا کہ یہ قومیں نسلی طور پر موجودہ تہذیبوں کے افراد سے برتر تھیں۔ ٹائن بی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ سازگار حالات کی وجہ سے ابتدائی تہذیبیں وجود میں آئیں۔ وہ چھ تہذیبیں جنہوں نے خود اپنی ابتداء کی ان میں سے ایک تہذیب مصری تہذیب (Egyptiac Civilization) کا ہم جائزہ لیتے ہیں کہ وہ کیسے وجود میں آئی۔ ٹائن بی لکھتا ہے کہ تہذیبوں کے آغاز سے قبل شمالی افریقہ کا تمام علاقہ صحارا اور عربین ڈیزرٹ (Sahara and Arabian Desert) وافر پانی کے ساتھ ہرا بھرا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بارشیں کم ہوتی گئیں اور یہ تمام علاقہ بتدریج صحرا میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ انسانوں کے ایک گروہ نے اپنی عادات کو بدل کر بدوی طرزِ زندگی اختیار کرلی۔ دوسری قسم کے لوگوں نے صحرا میں بدلتے ہوئے علاقے سے بچتے ہوئے جنوب کی طرف اور سکڑتے ہوئے سرسبز و شاداب سبز (Grassy) علاقوں میں رہائش رکھی اور اپنی پرانی طرزِ زندگی کو قائم رکھا اور تاحال اسی طرزِ زندگی پر قائم ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ دریائے نیل کے جنگلوں اور دریائی کچے علاقوں (Marshes) میں داخل ہوئے اور ہر آنے والی مشکل کا سامنا کیا۔ جنگلات صاف کئے۔ فصلوں کے لئے زمین تیار کی۔ رہنے کے لئے مکانات بنائے اور اس طرح مصری (Egyptiac) تہذیب وجود میں آئی۔ بقایا پانچوں ابتدائی تہذیبیں بھی کم وبیش اسی طرح وجود میں آئیں۔

اگلا سوال یہ ہے کہ تہذیبیں کیسے ترقی کرتی ہیں اور کیسے نشوونما پاتی ہیں یعنی:

1۔ قوموں کی ترقی کو جانچنے کے لئے ہمارے پاس کیا پیمانہ ہے؟ جب کوئی قوم جغرافیائی لحاظ سے پھیل رہی ہو ہمسایہ علاقوں پر قابض ہو رہی ہو تو کیا اس کا یہ مطلب ہے یہ تہذیب بڑھ رہی ہے؟

2۔ جب کوئی تہذیب مادی ٹیکنیک یعنی ٹیکنالوجی (Technology) میں ترقی کر رہی ہو تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ یہ تہذیب (Civilization) بڑھ رہی ہے؟

ٹائن بی (Toynbee) مختلف مثالیں دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی درست نہیں۔ بعض اوقات تہذیب جنگیں جیتنے کے بعد جغرافیائی اعتبار سے بڑھ رہی ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح زرعی اور صنعتی ترقی (Technology) تہذیبوں کی ترقی کا کوئی پیمانہ نہیں۔ **ٹائن بی (Toynbee) کہتا ہے کہ اصل مسئلہ بیرونی نہیں بلکہ اندرونی ہے' مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔**

ٹائن بی کہتا ہے کہ فرد اور تہذیب کا آپس میں جو رشتہ ہے اس کے بارے میں دو روایتی نظریئے رکھے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ تہذیب محض افراد کا مجموعہ ہے جس میں افراد آزاد ذرات (Atoms) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تہذیب ایک جاندار چیز ہے اور افراد محض اس کے سیلز (Cells) اور ممبرز (Members) ہیں۔ کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مندرجہ بالا دونوں نظریئے درست نہیں۔

ٹائن بی کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب افراد کے درمیان تعلقات کا ایک اہم نظام ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات استوار کئے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور تہذیب انسانوں کے دائرہ اعمال کا ایک مشترکہ میدان ہے لیکن اعمال و افعال کا سرچشمہ افراد ہیں اور تمام تر ترقی کی ابتداء چند تخلیقی افراد سے یا معاشرے کی چھوٹی اقلیت سے ہوتی ہے۔ یہ چند افراد دو کام کرتے ہیں۔ ان کا پہلا کام ہوتا ہے نظریئے کا حصول یا ''دریافت'' وہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ان کا دوسرا کام اپنے معاشرے اور تہذیب کے لوگوں کو اس نئی طرزِ زندگی پر ڈھالنا ہوتا ہے۔

لوگوں میں یہ تبدیلی (Theoretically) دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ تمام لوگ اسی کیفیت اور تجربے سے گزریں جس سے وہ چند تخلیقی افراد گزرے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ تمام لوگ ان کے ظاہری طریقوں کی نقل کریں یعنی میمز (Mimesis) سے۔ حقیقتاً دوسرا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے۔ میمز (Mimesis) ایک چھوٹا لیکن یقینی راستہ ہے جس سے تمام تر لوگ اور تمام قسم کے افراد مجموعی طور پر اپنے رہنما کی پیروی کر سکتے ہیں اور تہذیب کی ترقی ہو سکتی ہے' تہذیب بڑھ اور پھیل سکتی ہے۔

ان چند تخلیقی یا اقلیتی افراد کے میمز (Mimesis) کو زوال پذیر تہذیب کے اندرونی اور بیرونی پرولوٹیریٹز (Internal and External Proletariats) اختیار کرتے ہیں۔ اس تمام تحقیق میں لفظ پرولوٹیریٹ (Proletariat) سے ٹائن بی کا مطلب ہے کہ ایسے لوگوں کا گروہ جو ایک تہذیب میں موجود ہوتا ہے لیکن ذہنی اور دلی طور پر اس تہذیب کی تاریخ کے اس دور میں اس کا حصہ نہیں ہوتا۔ جتنی تیزی اور وسعت سے ان چند لوگوں کے میمز (Mimesis) دوسری تہذیب کے اندرونی اور بیرونی پرولوٹیریٹز (Inernal and External Proletariats) میں پھیلتے ہیں اتنی تیزی سے یہ نئی تہذیب پروان چڑھتی ہے اور بڑھتی ہے۔

اس کے بعد ٹائن بی (Toynbee) اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں ایسے لوگوں کی مثالیں پیش کرتا ہے جن کے میمز (Mimesis) کی بہت تیزی سے تقلید کی گئی۔ ٹائن بی اس ضمن میں حضرت محمد ﷺ کا ذکر کرتا ہے اور سینٹ پال (St. Paul)' سینٹ بناڈکٹ (St. Benedict)' سینٹ گریگری (St. Gregory)' بدھا' مکیاولی (Michiavelli) اور دانتے (Dante) کے نام لیتا ہے۔

تہذیب کے پروان چڑھنے میں کچھ اور عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً

1۔ دشوار گزار علاقوں میں جیسا کہ دریائے زرد (Yellow River) اور دریائے نیل کے جنگلاتی علاقوں میں پہلی تہذیبیں پروان چڑھیں۔

2۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ علاقے جہاں پچھلی تہذیب نے زیادہ پیش رفت نہیں کی وہاں بھی نئی تہذیب پروان چڑھتی ہے۔

3۔ ہیلنک (Hellinic) اور باقی تمام تہذیبوں کی تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اچانک تباہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ شکست ہارنے والی تہذیبوں میں نئی زندگی کے لئے ہیجان پیدا کر کے ان کے اعمالوں کی درستگی اور اگلی جوابی جنگ جیتنے کے لئے تیار کرتی ہے۔

تہذیب کا ٹوٹنا اور خاتمہ

ٹائن بی (Toynbee) خود سے سوال کرتا ہے کہ موت کا وہ کون سا دروازہ تھا جس سے پھلتی پھولتی سولہ تہذیبیں دم توڑ گئیں۔ کیا مغربی تہذیب اور اس وقت کی باقی زندہ تہذیبوں کا بھی یہی حشر ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو یہ تہذیبیں کتنا عرصہ اور زندہ رہیں گی؟ ان کے جواب کے لئے ٹائن بی نے ان وجوہات کو جاننے کی کوشش کی جن سے کسی تہذیب میں ٹوٹنے (BreakDown) کا عمل ہوتا ہے اور آخر وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ ٹائن بی کی تحقیق کا دوسرا حصہ انہی سوالات کے جوابات پر مبنی ہے لیکن جواب دینے سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تہذیبیں ایک دوسرے سے مختلف 'کیوں' اور 'کیسے' ہیں۔ ٹائن بی کے خیالات کی ایک امریکی ملٹری سکالر سیموئیل ہنگٹن (Samuel Huntington) نے قابل قدر وضاحت کی ہے۔ ہنگٹن (Huntington) سوال کرتا ہے کہ جب ہم تہذیبوں کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت میں وہ لکھتا ہے کہ تہذیب ایک تمدنی وجود ہے جس میں مذہب' گروہ' فرقے' قومیں' زبانیں اس کے وجود کا حصہ ہیں۔ مثال کے طور پر جنوبی اٹلی کے ایک دیہات کا کلچر شمالی اٹلی کے کسی دیہات کے کلچر سے مختلف ہے۔ لیکن دونوں اطالوی ثقافت کا حصہ ہیں جو کہ جرمن ثقافت سے مختلف ہے۔ اسی طرح جرمنی کے دیہاتوں کی ثقافت یورپی معاشرے سے ملتی جلتی ہے اس طرح تمام یورپی ثقافت ایک دوسرے سے نزدیکی مشابہت رکھتی ہے لیکن یورپی ثقافت اسلامی اور چینی ثقافت کے ساتھ کسی بھی طرح سے مشابہت نہیں رکھتی۔ یعنی مغربی لوگ' مسلمان اور چینی کسی ایک بڑی تہذیب کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ الگ الگ تہذیبیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ **تہذیب انسان کی سب سے بڑی گروہ بندی ہے اور ان تہذیبوں کے لوگوں میں سوائے اس کے کہ یہ سب انسان ہیں کوئی قدر مشترک نہیں پائی جاتی۔** تہذیب کا تعین اور پہچان میں اس کے مقاصد اس کے جزو یعنی مذہب' تاریخ' زبان' روایات اور تمدن شامل ہیں۔ یہ سب تہذیب کا جزو ہیں۔ اس طرح کسی بھی دو تہذیبوں میں مماثلت صرف یہ ہے کہ دونوں تہذیبوں کے افراد انسان ہیں۔ تہذیبیں متحرک (Dynamic) ہوتی ہیں۔ وہ اُبھرتی اور ڈوبتی ہیں۔ مختلف راستے اختیار کرتی ہیں اور دوسری تہذیبوں میں ضم بھی ہو جاتی ہیں اور جیسے ٹائن بی کہتا ہے کہ یہ ٹوٹ جاتی ہیں اور پارہ پارہ (Disintegrate) ہو جاتی ہیں' نظر آنا بند ہو جاتی ہیں اور وقت کی ریت میں دفن ہو جاتی ہیں۔ ٹائن بی کی طرح ہنگٹن (Huntington) بھی یہ

کہتا ہے کہ مغربی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک (Nation States) دنیا کے معاملات میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسا رہا ہے مگر صرف چند صدیوں کے لئے۔ ان چند صدیوں کو چھوڑ کر انسانی تاریخ میں سب سے اہم کردار اور حصہ تہذیبوں کا ہی ہے۔

ٹائن بی کہتا ہے کہ تہذیبوں کی دوڑ بہت لمبی دوڑ ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کچھ افراد کسی سو میل اونچی دیوار کی طرح چٹان (Cliff) پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس اونچی چٹان میں بڑے بڑے ہموار پتھر (Ledges) نکلے ہوئے ہوں۔ کسی ایک جھلک میں ہم کسی ایک چٹان کو دیکھیں کہ ایک آدمی ہموار پتھر (Ledge) پر لیٹا ہوا ہے' دوسرا جھکا ہوا ہے' تیسرا کھڑا ہوا ہے اور چوتھا چٹان پر ہموار پتھر (Ledge) کے قریب سے چڑھ رہا ہے تو یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ جو آدمی اس وقت چٹان پر چڑھ رہا ہے وہ لیٹے ہوئے آدمی سے مقابلہ جیت جائے گا۔ اسی طرح کسی ایک وقت کو دیکھ کر کسی تہذیب کے مقدر کا تعین کر دینا کہ وہ ٹوٹ چکی ہے یا دوسری تہذیب میں ضم ہو رہی ہے درست نہیں ہے۔ غرضیکہ کسی بھی تہذیب کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے کہ وہ ٹوٹ چکی ہے یا پارہ پارہ (Disintegrate) ہو چکی ہے ہمیں اس تہذیب کی کئی صدیوں کی تاریخ کا جائزہ لینا پڑے گا۔

اس کے بعد ٹائن بی نے تہذیبوں کے ٹوٹنے کے اسباب کے سلسلے میں مختلف نظریات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس نے ہر مقولے (Hypothesis) کی روشنی میں مٹ جانے والی تہذیبوں کا الگ الگ جائزہ لیا تا کہ وہ ان مقولوں (Hypothesis) کے 'غلط' یا 'صحیح' ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

1۔ ایک مکتبہ فکر کا استدلال یہ ہے کہ تہذیبیں ایسی وجوہات سے ٹوٹتی ہیں جو انسان کے بس میں نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہیلنک (Hallenic) تہذیب کے دوران یہ سمجھا جاتا تھا کہ تہذیبیں کائناتی تبدیلیوں کی وجہ سے ٹوٹ کر ناپید ہو جاتی ہیں۔ سائنس نے اس نظریئے کو رد کر دیا۔ سائنسدانوں کا یہ نظریہ ہے کہ کائنات کی تمام مادی چیزیں حرارت میں تبدیل ہو کر ختم ہو جائیں گی لیکن وہ وقت ہمارے تصورات سے دور ہے۔

2۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہذیبیں نسلی زوال پذیری (Racial Degeneration) کی وجہ سے ٹوٹتی ہیں اور آخر کار ختم ہو جاتی ہیں۔ ٹائن بی یہ کہتا ہے کہ یہ مفروضہ ٹانگے کو گھوڑے سے آگے لگانے کے مترادف ہے۔ نسلوں کا زوال (Racial Degeneration) معاشرتی زوال کا نتیجہ ہے معاشرتی زوال کی وجہ نہیں۔ یعنی نسلی زوال معاشرتی زوال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نسلی زوال اس لئے ہوتا ہے کہ معاشرے کے بگاڑ کی وجہ سے آنے والی نسلوں کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار اور استعمال کے لئے کوئی میدان نہیں ملتے۔

3۔ علاوہ ازیں ایک اور نظریہ جو پلاٹو (Plato) نے قائم کیا تھا اس کے مطابق تمام کائنات ایک دائرے کی شکل میں چل رہی ہے۔ گھومتے ہوئے چاند' سورج اور زمین اس بڑے فلکی نظام کا حصہ ہیں جو خود ایک دائرے میں سفر کر رہا ہے اور جیسا کہ اس فلکی نظام میں سبزہ اُگتا مرتا اور پھر اُگتا ہے تہذیبیں بھی اسی طرح پیدا ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر پیدا ہوتی ہیں اور پھر مر جاتی ہیں یا ناپید ہو جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہ تاریخ خود کو دھراتی ہے۔ ٹائن بی اس نظریہ کو رد کرنے کے لئے ایک لمبی بحث کرتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایک پہیہ گھومتا ہے لیکن وہ گھومتے گھومتے ختم نہیں ہوتا اور گاڑی کو منزل کی طرف لے جاتا ہے' اس طرح تہذیبوں کے پیدا ہونے اور ختم ہونے میں انسان کی ترقی پوشیدہ ہے۔

4۔ تہذیبوں کی ترقی کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے یہ دیکھا تھا کہ تہذیبیں اس لئے ترقی نہیں کرتیں کہ جغرافیائی طور پر پھیل رہی ہیں اور ٹیکنالوجی (Technology) میں ترقی کر رہی ہیں۔ ان دو چیزوں میں ترقی تہذیب کی ترقی کی وجوہات نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تہذیبیں ان دونوں میدانوں میں ترقی کے باوجود ٹوٹ رہی ہوتی ہیں۔ اسی طرح ٹیکنالوجی میں زوال' تہذیب کے زوال کا نتیجہ ہوتا ہے اس کا سبب نہیں۔ ٹائن بی لکھتا ہے کہ گبن (Gibbon) کا نظریہ کہ رومن سلطنت کا زوال اور ٹوٹنا جنگوں کے ہارنے کی وجہ سے ہوا غلط ثابت ہوا بلکہ جس وقت رومن سلطنت پر حملے ہوئے اس وقت سے پہلے ہی اس کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ آخر میں ٹائن بی نے بہت سی تہذیبوں کی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا کہ ان پر جارحانہ حملے اس وقت کامیاب ہوئے جب وہ ٹوٹ چکی تھیں۔

ٹائن بی تہذیبوں کے ٹوٹنے کی وجوہات کے تمام نظریات کی تحقیق کرنے کے بعد انہیں رد کر دیتا ہے اور اپنی تحقیق کا لب لباب پیش کرتا ہے کہ تہذیبوں کا ٹوٹنا (BreakDown) ان تین وجوہات سے ہوتا ہے۔

1۔ تہذیب کی اقلیت میں تخلیقی قوت ختم ہو جاتی ہے اور وہ محض ایک تسلطی' جابرانہ قوت بن جاتی ہے۔

2۔ نتیجتاً اس تہذیب کی اکثریت تہذیب کے میمز (Mimesis) کو چھوڑتی چلی جاتی ہے۔

3۔ اوپر والی دو وجوہات کی بناء پر اس تہذیب میں معاشرتی وحدت ختم ہو جاتی ہے جس سے اس کے ٹوٹنے (BreakDown) کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔

ٹائن بی کہتا ہے جب ہم مندرجہ بالا تینوں وجوہات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی بھی تہذیب کے ٹوٹنے کی سب سے بڑی اور اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان افراد کی اکثریت اس تہذیب کے میمز (Mimesis) کو ترک کر چکی ہوتی ہے۔ دوئم یہ کہ اگر اس صورت میں جب اکثریت اپنے میمز (Mimesis) چھوڑ چکی ہو اور کوئی دوسری تہذیب کے میمز (Mimesis) اپنا لے تو اس تہذیب کا زوال اور ٹوٹنا (BreakDown) بہت تیز ہو جاتا ہے اور وہ دوسری تہذیب میں تیزی سے ضم ہو جاتی ہے۔

تہذیبوں کا ٹکراؤ

دوسرے الفاظ میں تہذیبوں کی جنگ درحقیقت تہذیبوں کے میمز (Mimesis) کی جنگ ہوتی ہے۔ جس تہذیب کے میمز (Mimesis) پھیلتے چلے جائیں وہ تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے اور جو تہذیب اپنے میمز (Mimesis) کو چھوڑ دے وہ ٹوٹ کر ختم ہو جاتی ہے۔ ٹائن بی آخر میں لکھتا ہے کہ ان موجودہ زندہ تہذیبوں میں تمام تہذیبیں ٹوٹ چکی ہیں سوائے مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے۔ **اسلامی تہذیب کے علاوہ تمام تہذیبیں مغربی تہذیب میں ضم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وقت مغربی تہذیب کی جنگ اسلامی تہذیب کے ساتھ ہے۔** مغربی تہذیب کی اس یلغار کا پلڑا بھاری نظر آ رہا ہے لیکن یہ تعین کرنا کہ کون سی تہذیب یہ جنگ جیتے گی قبل از وقت ہوگا۔ کتاب کے آخر میں ٹائن بی مغربی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں بڑی طویل بحث کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تہذیبوں کے عروج اور زوال کا معاملہ مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ وہ افسوس کرتا ہے کہ اس کی تہذیب اپنے آباؤ اجداد کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے صحیح تصور سے بھٹک چکی ہے۔ اب اس کی تہذیب سترہویں صدی سے قومیت (Nationalism) کے بت کی پرستش کر رہی ہے۔ اس کے بعد اس کی تہذیب میں یہ رغبت (Temptation) پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ مکمل انسانیت کو متبادل بت بنا دے اور قومیت (Nationalism) کے بت کو چھوڑ کر انسانیت کے بت کو پوجنا شروع کر دے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہم بھول گئے ہیں کہ ہیلنک (Hellenic) تہذیب نے بھی مکمل انسانیت کو بت یا خدا بنایا تھا لیکن وہ ٹوٹ کر ختم ہو گئی۔ اب دو ہزار سال بعد مغربی تہذیب کا بھی ہیلنک (Hellenic) تہذیب جیسا انجام ہو سکتا ہے۔

ٹائن بی کہتا ہے کہ وہ سطح جس پر یہ روحانی جنگ لڑی جاتی ہے وہ حربی ہے نہ معاشرتی' نہ معاشی اور نہ ہی ذہنی ہے۔ وہ نازک سوالات اور مسائل جن سے مغربی فرد کو سامنا ہے وہ تمام مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب نے خود کو کئی بتوں کی پرستش پر لگایا ہے لیکن ان بتوں میں سب سے بڑا قومی عصبیت کی بنیاد پر قائم ہونے والی مملکت (Nation State) کا بت ہے جسے گروہی مملکت (Parochial State) کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جھوٹا مذہب یعنی گروہی مملکت کی عبادت ہی تھی جو ان سولہ تہذیبوں کی موت کا سبب بنی۔ آخر میں وہ مغربی تہذیب کی زندگی کے بارے میں بہت نا اُمید نظر آتا ہے پھر کہتا ہے وہ سیکولرازم (Secularism) لادینیت جس میں یہ دل برداشتہ مغربی تہذیب سترہویں صدی سے دھنس گئی اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ مغربی ارواح کے لئے یہ ناقابل برداشت ہو جائے گا کہ وہ زیادہ دیر مذہب کے بغیر رہیں۔ روحانی خلا نے مغربی لوگوں کو مختلف بتوں جیسے نیشنلزم (Nationalism) اور کمیونزم کی پوجا پر لگا دیا۔ دلبرداشتہ پیروکاروں نے مذہبی رواداری (Tolerance) کو ابتدائی طور پر آسان جانا لیکن اب جھوٹے خداؤں کو آزمانے کے بعد سترہویں صدی کی آغوش میں پلنے والی لادینیت (Secularism) کسی مذہب کے آگے دم توڑ جائے گی۔

سیکولرازم کی تعریف جو دی کیمبرج انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (The Cambridge Encyclopaedia, Britannica 1911) میں اس طرح ہے۔ **''سیکولرازم کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی اخلاقی اقدار کا معیار صرف موجودہ دنیاوی زندگی کی فلاح ہے جس میں خدا اور اگلے جہان کا کوئی تصور نہیں۔''**

ٹائن بی کی تحقیق اور حاصل مطالعہ

ٹائن بی کے خیالات اس کی زبان اور اس کے الفاظ سے انسان کے بارے میں کہانی، دنیا کے حقائق، انسان کی تخلیق کا مقصد' حق اور باطل کے درمیان دائمی جنگ کے بارے میں معلومات، کا علم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مختلف تہذیبوں کے درمیان ایک سنگین جنگ جاری ہے اور تہذیب کی کامیابی کا راز اس کے میمز (Mimesis) کسی بڑے کی پیروی میں ہے۔ اگر کوئی تہذیب قائم رہنا چاہتی ہے اور دوسری تہذیبوں کو توڑ کر اپنے اندر ضم کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنے میمز (Mimesis) کی حفاظت کرنا ہوگی' دفاع کرنا ہوگا' عزت اور محبت کرنا ہوگی اور صرف یہ ہی نہیں اس کو دوسری تہذیبوں کے میمز (Mimesis) سے خود کو دور اور بچا کر رکھنا ہوگا۔

تہذیبوں کی جنگ میں نہ تو کوئی دوست تہذیب ہے اور نہ کوئی غیر جانبدار تہذیب' خاص طور پر اس وقت جبکہ ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے دنیا ایک زمینی گاؤں (Global Village) بن رہی ہے۔ تہذیبوں کا ٹکراؤ ناگزیر (Inevitable) ہو چکا ہے۔ تہذیبوں کی اس جنگ کا کوئی تماشائی نہیں ہے اور نہ ہی کسی تہذیب کے افراد یہ لڑائی دیکھنے کے لئے اکھاڑے (Arena) کے باہر بیٹھے ہیں۔ صرف ایک اکھاڑا ہے (سکڑتی ہوئی دنیا) اور پانچ بلکہ اب صرف دو (Gladiator) تہذیبیں اپنی بقاء کے لئے لڑ رہی ہیں اور صرف قدرت دیکھ رہی ہے۔ ہم چاہیں نہ چاہیں پسند کریں نہ کریں اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ جنگ لڑنا ہوگی اور اگر ہم زندہ نہیں رہنا چاہتے تو مرنے سے پہلے مارکھانی پڑے گی۔

جب ہم نچلی سطح پر آتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر تہذیب اور ہر کمیونٹی میں ہر فرد اس گھمسان کی جنگ میں موجود ہے۔ ہر فرد کو قدرت نے اختیار دیا ہے کہ وہ اس میدان میں رہتے ہوئے لڑے اور اپنے رہنما کی پیروی کرے یا اپنی وفاداری تبدیل کر کے دوسری تہذیب کے میمز (Mimesis) کو اپنا لے' اس کی پیروی کرے اور اس طرح دشمن تہذیب میں شامل ہو جائے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ کتاب پڑھنے کے بعد اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ میمز (Mimesis) کسی بڑے کی پیروی ہے جو اس ناگزیر جنگ میں تہذیبوں کے مقدر کا فیصلہ کرتی ہیں۔

یہ میمز (Mimesis) کیا ہیں اور ان کے پیچھے کیا فلسفہ پنہاں ہے۔ اسلامی تہذیب کے میمز (Mimesis) کیا ہیں؟ کیا فائدہ کتابیں پڑھنے اور ڈگریاں حاصل کرنے کا اگر ہمیں نہیں معلوم؟ اسلامی تہذیب کے میمز (Mimesis) ہمارے پیغمبر ﷺ کی سنت ہی تو ہے۔ معلوم ہوا کہ جب تک مسلمان حضور ﷺ کی سنت پر قائم رہیں گے اسلامی تہذیب قائم رہے گی۔ اسلامی تہذیب اس وقت تک ٹوٹ ہی نہیں سکتی جب تک مسلمان حضور ﷺ کی سنت کو ترجیح دیتے رہیں گے' احترام کرتے رہیں گے' محبت کرتے رہیں گے اور نتیجتاً اس پر قائم رہیں گے۔ یعنی اسلامی تہذیب کی بقاء مسلمانوں کے اتباعِ رسول میں ہے۔

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے واں کنکر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

اقبال ٹائن بی کے کتاب لکھنے سے پہلے وفات پا چکے تھے انہیں اس دائمی حقیقت کا کیسے علم ہوا؟ پھر اقبال نے کہا!

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلمان کی نہیں

اقبال نائن بی کو جانتے بھی نہ ہوں گے لیکن پھر اقبال نے برملا کہا۔

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم اک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماز بھی کر لیتی ہے کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

انہوں نے کیسی تاریخی حقیقت بیان کی کہ اگر ملت نے حضور ﷺ کی سنت کی ناقدری کی اور اسے نظرانداز کیا تو اس کی تہذیب نہ صرف زمین بوس ہو جائے گی بلکہ اس کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ قوموں اور تہذیبوں کے گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے کہ قومیں اپنے اعمال کو درست کر لیں ورنہ قوموں کو مکافات عمل کے قانون کے تحت اپنی بداعمالیوں کی سزا بہرحال بھگتنا پڑتی ہیں۔

نائن بی نے جس راز کو پانے کے لئے 30 سال صرف کئے اقبال وہ راز چشم زدن میں پا گیا۔ ان کی معلومات کا ایک اندرونی ذریعہ تھا ان کا استاذ ان کا رہنما ان کے لئے روشنی کے مینار یعنی عشق رسول ﷺ۔ پھر مجھے خیال آیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا! (ابن عمرؓ راوی ہیں)

''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ ان ہی میں سے ہے۔'' (ابوداؤد)

حضور ﷺ کے فرمان کے حقیقی معنی اور گہرائی کا احساس اب شدت سے ہوتا ہے۔

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ ''نصارا دائیں سے مانگ نکالتے ہیں یہودی بائیں سے مانگ نکالتے ہیں تم درمیان سے مانگ نکالو۔''

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ ''یہودی ایک عید کرتے ہیں ہم دو عیدیں کریں گے۔''

الغرض ایک ایک قدم اور ایک ایک گھڑی اسلامی تہذیب کے میمز (Mimesis) یعنی سنت رسول ﷺ اور مغربی تہذیب کے میمز (Mimesis) میں مکمل تضاد ہے۔ ظاہری شکل و صورت، ہماری مانگ درمیان میں ہے ان کی بائیں طرف۔ ہمارے چہروں پر مونچھیں کٹی ہیں اور داڑھی سجی ہے ان کے چہروں پر مونچھیں بڑی ہیں اور داڑھی ندارد۔ بغلوں کے بالوں اور زیر ناف صفائی ہمارے لئے لازمی ہے حضرت ابراہیم ؑ کے وقت سے۔ ختنے ہمارے مذہب کا ضروری حصہ ہیں، لباس ہمارے ستر ہیں اور وہ چاہیں تو بے لباس پھر سکتے ہیں۔ ہمارے مرد اور عورتوں میں پردہ ہے اور وہ جانوروں کی طرح بے حجاب۔ ہمارے کھانے پینے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہے، بیٹھ کر کھانا، بیٹھ کر پینا۔ ان کے مختلف طریقے ہیں رواج اور مالی حیثیت کے مطابق۔ ہمارا صبح کو اٹھنے کا طریقہ سنت کے مطابق، غسل خانے جانے اور نہانے، باہر آنے کا طریقہ سب سنت کے مطابق ہے جو ہماری تہذیب کے میمز (Mimesis) ہیں۔ اس طرح صبح سے لے کر رات تک ہر منٹ، ہر گھڑی، ہر عمل اور ہر حرکت میں ہمارے اور مغربی تہذیب کے میمز (Mimesis) میں تضاد ہیں۔ اسلامی تہذیب ایک ایسی فلک بوس عمارت کی طرح ہے جو توحید کے پلاٹ (Plot) پر بنی ہے جس کی بنیادیں خوفِ خدا سے بہت گہری ہوں، اس کی دیواروں اور چھتوں کی اینٹیں، سیمنٹ، کرش اور لوہا سنت رسول ﷺ ہو۔ اخلاقِ رسول ﷺ اس کی فنشنگ (Finishing)، فرنیشنگ (Furnishing) اور سجاوٹ (Decoration) ہوں، عشق رسول ﷺ سے اس عمارت میں توانائی ہو، عمارت کے لوگوں کی ذہنی نشوونما (Mental Growth) اطاعت رسول ﷺ سے ہوئی ہو اور دل عشق رسول ﷺ سے سرشار ہوں اور حضور ﷺ کا مقصد حیات یعنی دنیا میں دین کی بالادستی ان کا مقصد حیات ہو۔ میں حضور ﷺ کی سنت کی اہمیت میں ایک بار پھر اقبال نے کہا

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

وفا کیا ہے؟ تقریریں؟ نہیں وفا عمل ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا!

''جو ایسے وقت میری سنت کو پکڑے گا جب وہ مٹ رہی ہوگی اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔''

کیوں؟ وہ اس لئے کہ جب ایک مسلمان ایک مٹتی ہوئی سنت کو زندہ کرتا ہے تو وہ حضور ﷺ کی امت کی زندگی دراز کر رہا ہوتا ہے اور اگر پچاس سالوں یا سو سالوں کے بعد بھی مسلمان جہاد کے لئے ہتھیار اٹھائیں گے تو اس فرد کا آنے والے مسلمانوں کے جہاد اور شہادت میں پورا پورا حصہ ہوگا۔ میدانی جنگ کبھی کبھی لڑی جاتی ہے میمز (Mimesis) کی جنگ ہر وقت اور تمام عمر لڑنی ہوتی ہے۔

برصغیر میں کلیسائی نظام تعلیم اور کالے صاحبوں کا وجود میں آنا

علامہ اقبال کو انگریزوں کے ٹھونسے ہوئے نظامِ تعلیم کی حقیقت معلوم تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد لارڈ میکالے (Lord Macualay) کو برطانیہ کی سرکار کی طرف سے کام سونپا گیا کہ وہ برصغیر کے 'جاہل اور اجڈ' لوگوں کے لئے ایک نیا نظامِ تعلیم ترتیب دے جو آئندہ آنے والے وقت کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ لارڈ میکالے (Lord Macualay) نے کمال عیاری کے ساتھ سب سے پہلے اس نظامِ تعلیم کا مقصد متعین کیا کیونکہ تمام کام ایک مقصد کے لئے ہی کئے جاتے ہیں۔ ان کا وہ تاریخی مقصد انہیں کے الفاظ میں یہ تھا۔

"The aim of our Education system in India should be to create a class of people Indian in blood and colour but English in taste, morals and Intellect."

''ہندوستان میں ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو خون اور رنگ میں تو ہندوستانی ہو لیکن پسند اور ناپسند، اقدار اور ذہنیت میں انگریز ہو۔''

میکالے (Macualay) کا مقصد پورا ہو چکا۔ چنانچہ حال ہی کا ایک مغربی تجزیہ نگار لکھتا ہے۔

"When the White Sahib had played his innings and was on his way out and the Brown Sahib was coming into play, the White Sahib handed over his bat as a gesture of good will, to the Brown Sahib."

(Times: May 1994)

''جب گوری چمڑی والا صاحب اپنی اننگز کھیل چکا اور میدان سے باہر آ رہا تھا اور کالا صاحب اس کی جگہ اندر کھیلنے جا رہا تھا تو خیر سگالی کے طور پر گوری چمڑی والے صاحب نے اپنا بلا کالے صاحب کو دے دیا۔''

ٹائن بی نے تہذیبوں کے ٹوٹنے کی جو پہلی وجہ بیان کی تھی کہ تخلیقی اقلیت زوال پذیر ہو کر محض ایک حاکم اقلیت بن جاتی ہے اسلامی دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی یہی ہوا۔ اگر اس حاکم اقلیت میں صرف تخلیقی قوت ختم ہوئی ہوتی تو ہم شاید زیادہ گلہ نہ کرتے لیکن یہ کالا صاحب مغربی تہذیب کا پیروکار بن گیا۔ اس قسم کے اندرونی پرولوٹیریٹس (Internal Proletariats) تمام اسلامی ملکوں پر حاکم ہیں۔

ٹائن بی لکھتا ہے کہ اندرونی پرولوٹیریٹس (Internal Proletariats) کی تعریف اس طرح ہے ''یہ کسی بھی تہذیب کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو جسمانی طور پر تو اس تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں لیکن ذہنی اور دلی طور پر اس تہذیب کا حصہ نہیں ہوتے۔'' اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کے کالا صاحب غریب اور مظلوم عوام سے وہی سلوک کرتے ہیں جو انگریز حاکم اپنی غلام رعایا سے کرتا تھا۔ ان مغرب زدہ گماشتوں کا مقصدِ حیات صرف اور صرف یہ ہے کہ ان کے پاس وسائل ہوں خواہ ان کے ذرائع کچھ بھی ہوں جن سے وہ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھ سکیں، پاپ میوزک سے دل بہلا سکیں، جینز پہن کر برگر کھا سکیں۔ چلیں ان کے ان کے برگر کھانے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے اگر یہ غریب اور مظلوم عوام کو پیٹ بھر کر روٹی کھانے کا بندوبست کر دیتے جو کہ یہ کر سکتے ہیں۔

اب تہذیبوں کے زوال کی تیسری وجہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو ٹائن بی نے 30 سالہ تحقیق کی بنیاد پر قائم کی یعنی معاشرتی وحدت کا ٹوٹ جانا۔

یہ دیکھنا مشکل نہیں جب معاشرتی وحدت ختم ہو جائے تو سیاسی وحدت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی وحدت کے ختم ہونے سے پہلے معاشرتی وحدت کا خاتمہ ہونا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بڑی مثال 1971ء میں پاکستان کا دولخت ہونا ہے۔ اصولی و مکمل بات یہ ہے کہ وحدت، پہلے روحانی وحدت ہوتی ہے پھر معاشرتی وحدت ہوتی ہے اس کے بعد سیاسی وحدت قائم ہو سکتی ہے۔ یہ حیران کن ہے کہ ملت کی وحدت کے سلسلہ میں علامہ اقبال نے بغیر کسی تحقیق کے وہ نتائج مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جو مغربی دانشور (Scholars) بڑی تحقیق کے بعد تیار کرتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو — آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بھی مذہب اسی وقت پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا ہے، جب اسے قوت سلطنت کی پشت پناہی حاصل ہو ورنہ مذہب یتیم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پچھلے دو سو سالوں سے اسلام کی پشت پر مملکت کی طاقت نہ ہونے کی وجہ یہی تھی کہ انگریز راج میں مسلمان اَن گنت فرقوں میں بٹ گئے۔

آخری وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے، اللہ اور رسول ﷺ نے مسلمانوں کو خلافت قائم کرنے کا حکم دیا ہے جمہوریت نہیں، آمریت نہیں اور نہ ہی مذہبی سوشلزم، کمیونزم یا جرنیلی راج۔ ٹائن بی اور بھی بہت باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً 1930ء میں وہ لکھتا ہے کہ افغانستان میں صحیح اسلامی تہذیب موجود ہے اور یہیں سے یہ تہذیب دوبارہ اُبھرے گی۔ سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنے سے اُمت کی بقاء ہے اور سنت کو چھوڑنے سے نہ صرف امت کا شیرازہ بکھرے گا بلکہ امت کے پارہ پارہ ہونے کا احتمال اپنے تمام تر ثبوتوں کے ساتھ موجود ہوگا۔

جمہوریت کیا ہے؟

غالباً یہ ارسطو نے کہا تھا کہ بحث کرنے سے پہلے "Let us first define our terms (Terminologies)" یعنی جو اہم اصطلاحات استعمال کریں پہلے ان پر متفقہ فیصلہ کر لیں کہ ان سے ہماری کیا مراد ہوگی۔ جمہوریت کی کئی سو تعریفیں ہیں اس لئے اس کی ایک بین الاقوامی مانی جانے والی تعریف کا تعین کر لیں اس کے بعد ہوگی کہ جمہوریت کے اساسی (Fundamentals) اور اجزاء (Constituents) کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے اس سے انشاءاللہ ہمیں اس نظام کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور صاف ظاہر ہے کہ کسی چیز کو سمجھنے کے بعد ہی انسان درست رائے قائم کر سکتا ہے۔

ڈیموکریسی (Democracy) یونانی لفظ لوگ (Demos) اور کریٹز (Kratos) حاکمیت سے بنا ہے یعنی لوگوں کی اتھارٹی (Authority) لوگوں کی حکومت' لوگوں کی حاکمیت۔

امریکہ میں لنکن کی تعریف کے بعد جمہوریت کی سب سے پسندیدہ تعریف ای وی وائٹ (E.V. White) کی تسلیم کی جاتی ہے جو انہوں نے دوسری جنگ عظیم میں امریکی وار بورڈ (War Board) کے استفسار پر انہیں بھیجی۔ یہاں عرض کرتا چلوں کہ جنگ کے دوران امریکہ کو جمہوری طریقہ سے نظامِ حکومت چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے اکثر مثبت اقدام میں جمہوری قوانین آڑے آ رہے تھے اس لئے انہوں نے ملک کے دانشوروں سے کوئی حل تلاش کرنے کے لئے کہا اور جمہوریت کی وضاحت طلب کی۔ اس پر جمہوریت کی تعریف درج ذیل لفظوں میں بیان کی۔

"Democracy is the recurrent suspicion that more than half the people are right more than half the time...."

''یعنی جمہوریت بار بار ابھرنے والا شک ہے کہ آدھے سے زیادہ لوگ آدھے سے زیادہ بار صحیح ہوتے ہیں۔'' (اخبار دی نیویارک' فروری 1943ء)

ایک اور تعریف یہ ہے:

"In the strict meanings elements of the word democracy means merely rule by the many" (Elements of Democratic Government by Corry and Abraham, New York, Oxford University Press, 1964)

''یعنی جمہوریت کا مطلب ہے اکثریت کی حکومت۔''

بہر حال جو تعریف اپنے خوبصورت الفاظ کی وجہ سے سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور بین الاقوامی طور پر صحیح تسلیم کی جاتی ہے وہی جو لنکن نے 1863ء کے لگ بھگ ان الفاظ میں بیان کی۔

"It is a system of Government of the people, for the people and by the people."

''یعنی لوگوں کی حکومت لوگوں کے لئے اور لوگوں کے ذریعے۔''

جیسے ڈیموکریسی (Democracy) یونانی لفظ ہے اس کی ابتداء بھی یونان ہی سے ہوئی۔ یونانی لوگ کئی سو خداؤں کو مانتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہر چیز کا الگ الگ خدا ہے جیسے زندگی کا خدا' موت کا خدا' شادی کا' صحت کا' بارش کا' محبت کا' بیماری کا اور قحط وغیرہ کا۔ گریک مائتھولوجی (Greek Mythology) اس کا مشہور نام ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس نظریہ کے تحت ایک خدا دوسرے خدا کے معاملے میں دخل نہیں دیتا لہٰذا یونانی دانشوروں نے لوگوں کو بادشاہوں کے جبر اور ظلم سے نجات دلانے کے لئے یہ نظریہ عام کیا کہ جب خود خدا تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا اور نظامِ کائنات چلانے کے لئے دوسرے خداؤں کو اختیار تفویض (Delegate) کر رکھے ہیں تو یونان کا بادشاہ خدا سے زیادہ طاقتور اور بڑا تو نہیں کہ اکیلا ہی تمام اختیارات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح لوگوں نے بادشاہ پر دباؤ ڈالا کہ معاشرے میں اختیارات کی تقسیم ہونی چاہئے۔ نتیجتاً یونان کی سٹی سٹیٹس (City States) میں جمہوریت کا نظام 170 سال (338-508 ق م) تک رائج رہا۔ یعنی اکثریت کی حکومت قائم رہی لیکن Athens کا ایک سرکاری مذہب تھا۔ یعنی انگریزی اصطلاح میں چرچ اور اسٹیٹ یکجا تھے۔

لیکن سقراط کی عقل نے یہ نظام مسترد کر دیا ہم جانتے ہیں کہ سقراط اس جمہوری نظام کی مخالفت اور تنقید کرتا رہا یہاں تک کہ جمہوریت کی تائید کرنے سے زہر کا پیالہ پی کر مرنے کو زیادہ بہتر سمجھا۔ فیصلہ اکثریت نے کیا اور اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اسی طرح ارسطو (Aristotle) اور افلاطون (Ploto) جمہوریت کے سخت مخالف رہے۔ سقراط نے ایک مشہور تمثیل میں لکھا کہ یہ ایک بدترین نظام ہے اور جمہوریت کی مثال ایک ایسے بحری جہاز کی ہے جس کا کپتان 'عوام' جہاز رانی' موسم اور ستاروں کے علوم سے محروم ہے اس لئے وہ کسی وقت بھی جہاز کو اپنی ناعاقبت اندیشی سے پاش پاش کر سکتا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یونان کے ایک شہر سپارٹا (Sparta) میں جب یورگس (Yeurgus) سے کسی نے جمہوریت کا مطلب پوچھا تو اس نے جواب دیا ''جاؤ پہلے اپنے گھر میں جمہوریت قائم کرو۔''

اب جمہوری نظام کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان بنیادی اجزاء (Constitutents) کا جائزہ لینا ہوگا جن پر یہ نظام قائم ہے۔ اس کے تین اجزاء ہیں۔

1۔ حکومت (Government)

2۔ آئین (Constitution)

3۔ اکثریت (Majority)

طرزِ حکومت کی درجہ بندی

سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ حکومت کے کتنے ہیں۔اس کی بہت سی قسمیں (Classifications) کی گئی ہیں۔کوئی بھی مکمل (Perfect) نہیں۔لیکن اب تک جو سب سے بہتر درجہ بندی (Classification) تسلیم کی جاتی ہے وہ ارسطو (Aristotle) نے کی تھی۔

1۔ فردِ واحد کی حکومت (Monarchy, Dictatorship etc)

2۔ چند لوگوں کی حکومت (Aristocracy)

3۔ اکثریت کی حکومت (Democracy)

جمہوریت کا دوسرا جز آئین ہے۔ آئین کی مختصر تعریف۔ملک کا نظام ایک دیئے گئے قانون کی تحت چلانے کے لئے حکومت ایک پہلے سے بنائے ہوئے دائرہ اختیار اور قانون کے اندر اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ان حدود دائرہ کار اور بنیادی قانون کو ہم آئین کہتے ہیں۔آئین حکومت کے (Organs) کا تعین کرتا ہے یعنی قانون ساز ادارہ (Legislature)' عدلیہ (Judiciary) اور انتظامی حکومت (Executive) وغیرہ یہ کام کیسے کریں گے۔ان سب کے اختیارات آئین میں دیئے جاتے ہیں اور انفرادی حقوق (Individual Rights) کا تعین کیا جاتا ہے اور ان کی حفاظت کا بندوبست آئین ہی کے تحت کیا جاتا ہے۔آئین کو تبدیل کرنا مشکل بنا دیا جاتا ہے جیسے دو تہائی کی اکثریت کی ضرورت وغیرہ۔مختصراً ہم یہ کہیں گے کہ آئین ایک طریقہ ہے' ایک قانون ہے ملک کو چلانے کا۔مختصر الفاظ میں یہ سمجھا جائے کہ جمہوری نظام میں آئین کی وہ حیثیت ہے جو اسلام میں قرآن اور سنت کی ہے۔امریکہ' برطانیہ' فرانس وغیرہ نے کسی فرد پر جبر نہیں کیا کہ وہ ان کے ملک کا باشندہ بنے لیکن اگر وہ ایک بار ملک کا شہری (Citizen) بن گیا ہے اب اسے ملک کے آئین کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی بلکہ اگر وہ صرف وہاں رہ رہا ہے تب بھی اسے اس ملک کے آئین کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں۔اسی طرح دین اسلام کے ہر پیروکار مسلمان مرد و عورت پر قرآن و سنت کی اطاعت لازم ہے۔جمہوریت میں آئین کی اطاعت کروانا انگلستان میں وزیراعظم جبکہ امریکہ اور فرانس میں صدر کا فرض ہے۔ دین اسلام میں یا اسلامی نظام کے تحت یہ فرض اللہ کے نائب یعنی خلیفہ پر لازم ہے۔

اب ہمارا کام آسان ہو گیا جیسے اسلام کے بارے میں جاننے کے لئے ہم قرآن اور حدیث کو دیکھتے ہیں اس طرح اگر جمہوریت کو صحیح طریقے سے جاننا ہو تو ہمیں جمہوری ملکوں کے آئین کا مطالعہ کرنا ہوگا اور یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔

جمہوری نظام ایک لادینی نظام ہے

برطانیہ' امریکہ' فرانس ماڈل جمہوری ملک تسلیم کئے جاتے ہیں۔اس لئے ہم ان ممالک کی بات کریں گے۔برطانیہ کا آئین میگنا کارٹا (Magna Carta) کے بعد کئی سوئیچوٹس (Statutes) کو ملا کر بنایا جاسکتا تھا مگر انہوں نے اپنی امتیازی حیثیت کو ہر صورت برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ویسے بھی آبادی میں مختصر قوم ہونے کے ناطے سے ان میں ایک یکجہتی بھی ہے۔اس لئے انہوں نے اپنا آئین غیر تحریری رکھا ہوا ہے۔اس لئے امریکہ اور فرانس کے آئین جو ہمارے سامنے ہیں ہم انہیں دیکھ لیتے ہیں۔

اول الذکر یہ کہ دونوں آئینوں میں کسی جگہ بھی خدا کا ذکر ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام جمہوری ممالک کے آئین دیکھ لیجئے چاہے وہ یورپ کے ہوں' ایشیا یا امریکہ یا افریقہ کے سوائے پاکستان کے کسی بھی جمہوری آئین میں لفظ 'خدا' نظر نہیں آئے گا۔**امریکہ کے آئین میں خدا کے وجود کا سرے سے اقرار ہی نہیں بلکہ یوں کہئے اس آئین کے تحت ملک کو چلانے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔**دوسرے لفظوں میں یوں سمجھا جاتا ہے کہ مملکت (State) اور چرچ (Church) کو الگ الگ رکھا جائے۔مملکت کے معاملات میں چرچ کو مداخلت کی اجازت نہیں دی جائے گی یعنی یہ حکومت سیکولر طریقے سے چلے گی۔امریکہ کے آئین میں پہلی ترمیم 15 دسمبر 1791ء میں کی گئی تھی۔

"Congress shall make no law respecting the establishment of religion."

''کانگریس کسی بھی مذہبی ادارے کے بارے میں کوئی قانون نہیں بنائے گی۔''

باقی جملہ یہ ہے۔

"or prohibiting the free exercise thereof...."

مطلب یہ ہے کہ کانگریس کسی مذہبی معاملے میں مداخلت نہیں کرے گی۔

یہ شق ہے جس سے مملکت (State) اور مذہب (Church) الگ الگ کر دیئے گئے ہیں یعنی امورِ مملکت سیکولر بنیادوں پر چلائے جائیں گے۔امریکہ میں بسنے والے تمام عیسائی' یہودی' دہریئے اس سیکولر آئین پر متفق و متحد ہیں۔

امریکہ کے آئین میں لفظ 'سیکولر' اس لئے نہیں پایا جاتا کیونکہ اٹھارہویں صدی میں یہ اصطلاح عام نہیں تھی لیکن بیسوی صدی میں بنائے جانے والے تمام آئینوں میں یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ جمہوری ماڈل فرانس کی پانچویں ری پبلک (Republic) کا آئین جو 28 ستمبر 1958ء ریفرنڈم کے ذریعہ منظور کیا گیا تھا اس میں آرٹیکل نمبر 2 یوں ہے۔

Article No.2

"France is a Republic, Indivisible, Secular, Democratic and Social."

اسی میں ہے:

"It's Principle is Government of the people by the people and for the people."

بیسویں صدی میں تمام جمہوری ملکوں کے بنائے گئے آئین بھی ابتداء میں ہی بیان کر دیتے ہیں کہ حاکمیت لوگوں کی ہوگی۔ مثال کے طور پر فرانس کے آئین دیکھ لیں۔

Article No.3

"National sovereignty belongs to the people....."

''ملک کے مقتدرِ اعلیٰ لوگ ہوں گے۔''

یعنی ملک پر حاکمیت عوام کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری نظام ایک لادینی نظام ہے اور اس میں انسان کی حاکمیت کو تسلیم اور قائم کیا گیا ہے۔ **لادینیت کو آئین کے ذریعہ بقاء دی گئی ہے' دائمی تحفظ مہیا کیا گیا ہے اور فلاح دی گئی جبکہ مذہب کو کیپسول میں بند کر دیا گیا ہے۔ اسمبلیاں کسی مذہب یا دین کی تائید میں کوئی قانون نہیں بنا سکتیں۔ مغربی مفکر کہتے ہیں کہ اس سے مذہبی جن بند رہیں گے اور عوام میں تفرقہ نہیں پڑے گا۔ لوگ لادینی اصولوں پر متحد کر دیئے گئے ہیں اور سٹیٹ کی طاقت سے یعنی اسمبلیوں (Legislature) اور عدالتی نظام کے آکسیجن ٹینٹ میں سیکولرازم کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کام نہایت مہارت سے کیا جاتا ہے۔**

امریکہ میں چرچ کو الگ رکھنے کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میں یہاں دو مثالوں کا ذکر کروں گا۔

1۔ 1962ء میں اوریگن (Oregon) ریاست کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ کسی بھی قسم کے سکولوں کو سرکاری ہوں یا پرائیوٹ' سرکار (مملکت) کے پیسے سے بچوں کو دینی کتب نہیں دی جا سکتیں کیونکہ یہ آئین کی ترمیم نمبر 1 (Amendment No. 1) کی خلاف ورزی ہوگی۔

(Corry and Abraham, 1964 page 248)

2۔ ایک اور دلچسپ فیصلہ' الی نیوس (Illinois) ریاست کے شہر کمپین (Champaign) میں سکول کے اوقات کے دوران کلاسز سے فارغ اوقات میں اضافی پیریڈ ہوتا تھا جس میں بچوں کو ان کے والدین کی تحریری خواہش پر ایک مذہبی استاد باہر سے آ کر دینی تعلیم دیتا تھا۔ یہ معاملہ امریکہ کی سپریم کورٹ تک پہنچا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ

''یہ آئین کے آرٹیکل نمبر 1 (Article No. 1) کی خلاف ورزی ہے اور یہ کام غیر آئینی ہے کیونکہ بچوں کو سکول لانے والی بسیں مملکت (State) کی ہیں اور اسکول کی عمارت بھی مملکت کی ہے۔ مذہب (چرچ) کو مملکت میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' اور اس کے بعد دینی تعلیم کا پیریڈ بند کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ سپریم کورٹ نے 8:1 کی تائید سے دیا' اس پر لوگوں نے بہت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ لیکن آئین آئین ہوتا ہے (Corry & Abraham 1964, page 249) ایک اور ایسے ہی فیصلے پر امریکی عوام نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ کیس نیویارک پرئیر کیس (New York Prayer Case) کہلاتا ہے۔

3۔ نیویارک کے سرکاری تعلیمی بورڈ نے ایک بائیس الفاظ کی Non Denominated دعا تیار کی یعنی ایسے الفاظ میں دعا جو تمام مذاہب کو قابل قبول ہو۔ یہ دعا اساتذہ اور طالب علم اپنی اپنی جماعتوں میں کلاسز شروع ہونے سے پہلے پڑھنے لگے۔ معاملہ پھر امریکی سپریم کورٹ تک پہنچ گیا۔ امریکی سپریم کورٹ نے دعا کے اس سلسلہ کو اپنے فیصلہ میں 8:1 سے پابندی لگا دی کہ چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ رکھنے کی آئینی شق کی خلاف ورزی ہے۔ کورٹ نے کہا کہ امریکی کی تمام ریاستوں کو سرکاری طور پر ایسی دعا بنانے یا منظوری دینے سے پرہیز کرنا چاہئے اور یہ کام مذہبی لوگوں پر چھوڑ دینا چاہئے۔

(Corry & Abraham 1964, page 251)

یہ وہ قابل ذکر وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر مغربی عوام جمہوری نظام کی لادینیت سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں اور روحانیت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا (علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

''وہ ہٹا کر دین سیاست سے بن جاتا ہے جمہوری''

اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ شیطان نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور وجہ بھی بتا دی کہ میں اس (آدم) سے بہتر ہوں مگر خدائی حاکمیت کا انکار نہیں کیا۔ یہ صرف انسان ہی کا کام ہے کہ نہ صرف اللہ کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے بلکہ اس کے خلاف بغاوت کر کے اپنی حاکمیت کا اعلان بھی کرتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ انسان اپنے اس فیصلے کو صحیح بھی سمجھتا ہے۔

دراصل مغربی جمہوریت ایک ایسی مصیبت کا شکار ہوگئی ہے جس میں تمام مذاہب اور تمام قومیتوں کے لوگوں کو متحد کرنے کے لیے سیکولرازم کو قائم رکھنا اس کی مجبوری ہے۔ اگر اسمبلیاں (Assemblies) مذہبی تائید میں کوئی قانون سازی کرتی ہیں تو ان کو اکثریت کی حاکمیت کے ساتھ خدا کی حاکمیت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے اور اس سے پورے سیکولر اور جمہوری آئین کی روح نکل جاتی ہے کیونکہ اس کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) لوگوں کی ہے۔ ظاہر ہے ایک ملک میں دو حاکمیتیں نہیں ہوسکتیں۔ دو خدا نہیں ہوسکتے یا دوسرے لفظوں میں دو قانون نہیں ہوسکتے۔

مذہب کو قانون سازی میں لانے کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ان کے الفاظ کے مطابق مذہبی جنات بوتلوں سے باہر نکل آئیں گے جس سے ان کی اپنی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ان کے لئے اتنا خطرناک اور خوفناک بن چکا ہے کہ مغربی جمہوریت ہر قیمت پر سٹیٹ اور چرچ کو الگ رکھنے پر مجبور ہے۔ سیکولرازم نے جو ہمارے ترکی بھائیوں کے لئے مشکل حالات پیدا کر دیئے ہیں اس سے تمام مسلمان اور دین کی سمجھ رکھنے والے لوگ بخوبی واقف ہیں اور ان کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس عذاب سے نجات عطا فرمائے۔ (آمین)

مغربی اقوام کا یہ فیصلہ کہ فردِ واحد اپنی مرضی کا کلی مختار نہیں ہوگا اور ملک میں بسنے والے لوگوں کی مرضی کو اولیت دی جائے گی۔ اس کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ ہر ہفتے پورے ملک میں ووٹنگ اور ریفرنڈم ہو اس لئے نمائندہ جمہوریت (Representantive Democracy) وجود میں آئی۔ لوگ اپنی حاکمیت چند نمائندوں کو اکثریت کی بنیاد پر تفویض (Delegate) کر دیتے ہیں۔ یہ نمائندے اکثریت کی بنیاد پر وزیراعظم کا انتخاب کرتے ہیں حکومت اور قانون سازی کرتے ہیں یعنی حاکمیت کے لئے ایک اقلیت وجود میں آجاتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ پارلیمانی طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ یہ کہ اسمبلی ممبرز (Congress) کے انتخاب کے علاوہ لوگ اکثریت کی بنیاد پر ایک حاکم چن لیتے ہیں یعنی اپنی حاکمیت ایک فرد کے ہاتھ میں ایک معینہ مدت کے لئے دے دیتے ہیں یہ صدارتی طریقہ نظام ہے۔

دونوں طریقوں میں یہ حاکم اقلیتیں آئین کے دائرے کے اندر جو قانون سازی کرنا چاہیں کر سکتی ہیں۔ ان کی قانون سازی کی طاقت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک برطانوی دانشور کہتا ہے کہ ''انگلستان کی پارلیمنٹ اتنی طاقتور ہے کہ وہ چاہے تو عورت کو مرد قرار دے وہ چاہے تو حرام بچے کو حلالی قرار دے اور اگر وہ چاہے تو مجرم کو اپنے مقدمہ میں خود جج بنا دے۔''

جمہوریت کی خصوصیات

ہماری اب تک کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جمہوریت کی چار بڑی خصوصیات ہیں۔

1۔ لوگوں کی حاکمیت (Sovereignty of the People)

2۔ سیکولرازم/لادینیت (Secularism)

3۔ آئین پرستی (Constitutionalism)

4۔ اکثریت سازی (Majoritarianism)

اگر نظامِ جمہوریت کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے اور اس کی اب تک کی کارکردگی دیکھی جائے تو اس میں مغربی تہذیب کے لئے ان کی رائے میں کچھ مثبت پہلو نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر جمہوری نظام نے معاشرے کو جنگوں اور فساد سے نکال کر متحد کر دیا۔ لوگوں کو موقع اور حق دیا کہ وہ اپنی مرضی کی حکومت بنائیں اور تبدیل کریں۔ معاشرے میں لوگوں کو مکمل شخصی آزادی دی کہ وہ آئین کے دائرے میں رہ کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہی کی رائے کے مطابق جمہوری نظام چند چیزوں کا حل پیش نہیں کر سکا اور معاشرے کے مجموعی حالات کار کو اخلاقی قدروں کی بنیاد پر حل کرنے میں ناکام رہا۔

سب سے پہلی ناکامی کہ معاشرے کی اقدار تیزی سے بگڑی چلی جارہی ہیں۔ تمام مذاہب حق اور اخلاقی اقدار کا معیار مقرر کرتے ہیں لیکن جمہوری نظام نے سیکولرازم کے تحت تمام مذاہب کو کیپسول میں بند کر دیا۔ اس طرح نہ صرف حق کے معیار پر کاری ضرب پڑی بلکہ اس کی دائمی حیثیت بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ اقدار کا معیار 'حق اور ناحق کا تعین کرنا جو اب تک خدا واحد کے حکم سے چلا آرہا تھا۔ عوام کے توسط سے نمائندہ اسمبلیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ نتیجتاً ہم نے بیسویں صدی میں دیکھ لیا کہ مغرب میں تمام حیوانی اطوار جائز ہوتے چلے گئے۔ ہم جنس پرستی (Gay, Lesbianism)' جانوروں کے ساتھ بدفعلی' لامحدود زنا (Open Marriages)' بچوں کے ساتھ بدفعلی' مکمل طور پر برہنہ پھرنے کے لئے علاقوں کا تعین کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ آپ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ یعنی آزادی کے پجاری نہ صرف نفس کے تابع بلکہ ہوس کے پجاری بن گئے۔ بگڑتے ہوئے معاشرے نے اپنے معیار کے مطابق اپنے قائد چنے کیونکہ یہ قائدان ہی میں سے تھے اور ان کے ووٹوں ہی سے قائد بنے تھے لہٰذا عوام کی خوشی کے لئے انہیں مزید گمراہ کرتے چلے گئے۔ اس طرح اگلے انتخابات تک معاشرہ تیزی سے بگڑ چکا تھا۔ اس مزید بگڑے ہوئے معاشرے نے کردار کے کمزور لوگوں کو اپنا حاکم مقرر کیا اور اسی نئی قیادت نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں سیکولرازم کا مسئلہ مغرب کے لئے بہت سنگین ہے۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں ٹائن بی نے کہا!

"That the Phenomenon of the growth and breakdown of civilizations is not physical but spiritual."

''تہذیبوں کے ترقی کرنے اور ٹوٹنے کی وجوہات مادی نہیں بلکہ روحانی ہوتی ہیں۔''

"He also laments that his society has astrayed from the one true God of their forefathers and since seventeenth century it was now worshipping the idol of Nationalism."

''وہ بہت افسوس کرتا ہے کہ اس کی تہذیب اپنے آباؤاجداد کے ایک حقیقی خدا کے تصور سے بھٹک گئی ہے اور سترہویں صدی کے اواخر سے اب وہ قومیت کے بت کی پرستش کر رہی ہے۔''

He says "The plain on which the spiritual battle is to be fought is neither military nor social nor economic, nor intellectual. The critical questions and problems confronting man are all religious."

''وہ کہتا ہے کہ وہ سطح جس پر روحانی جنگ لڑی جاتی ہے نہ فوجی، نہ سماجی، نہ معاشی، نہ فکری ہے بلکہ تمام فیصلہ کن سوالات اور مسائل جن کا انسان کو سامنا ہے سب مذہبی ہیں۔''

"In his opinion this spiritual vacuum will not last long i.e, western souls will not find it bearable to live without a religion for long."

''ان کے نظریہ کے مطابق یہ روحانی خلا زیادہ دیر نہیں رہے گا یعنی مغربی افراد کے لئے مذہب کے بغیر زیادہ دیر رہنا ناقابل برداشت ہوگا۔''

مغربی تہذیب کا زوال یقینی ہے

ضمناً عرض کروں قابل غور بات یہ ہے کہ ٹائن بی نے یہ نہیں کہا کہ عیسائیت کے بغیر زندہ نہیں رہیں گے بلکہ وہ مذہب کا کوئی تعین نہیں کرتا البتہ ایک خدا کے ہونے کے عقیدہ کی بھی بات کرتا ہے۔ یہ تمام حوالے جن کا ذکر کیا گیا ان کا مقصد یہ ہے کہ ٹائن بی نے کہا کہ روحانی زوال تہذیب کے ٹوٹنے اور ختم ہونے کا سبب بنتا ہے اور مغربی تہذیب سترہویں صدی کے اواخر سے روحانی خلا کا شکار چلی آ رہی ہے۔

ہمیں یہ معلوم ہوا کہ جمہوری لادینی نظام نے مغربی قومیتوں میں سیاسی وحدت پیدا کر کے انہیں جغرافیائی قومیں (States) بنایا۔ سیکولرازم کے تحت بنائے ہوئے آئین نے امریکہ، فرانس اور آسٹریلیا جیسے ملکوں کی ریاستوں اور مختلف مذاہب اور قومیتوں کو متحد رکھا ہوا ہے اور جب تک ان کے آئین سیکولر رہیں گے ان ممالک میں جمہوری نظام صحیح طریقے سے چلتا رہے گا اور ملک کی وحدت قائم رہے گی۔ اب ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ مغربی تہذیب کی ترقی اور بقاء تو روحانی ترقی میں ہے اور جمہوری ملکوں کی بقاء سیکولرازم کے قائم رہنے اور روحانی خلاء اور روحانی خاتمے میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں سیکولرازم مغربی ممالک کے جمہوری آئین کے لئے اور جمہوری مملکت کی وحدت کے لئے آب حیات کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مغربی تہذیب کے لئے یہ ایک ویسا ہی زہر کا پیالہ ہے جیسا سقراط (Socrates) نے پیا تھا۔

1۔ اب اگر مغربی ممالک میں جمہوری نظام یوں ہی چلتا رہا تو مغربی تہذیب کا خاتمہ (BreakDown) یقینی ہو جائے گا۔

2۔ اگر مغربی فرد (جیسا کہ ٹائن بی کہتا ہے کہ مذہب کے بغیر نہیں رہے گا) سیکولرازم کے خلاف بغاوت کرتا ہے تو مغربی ممالک ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

3۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ مغربی ملکوں میں سیکولرازم اور روحانیت (Spiritualism) مذہب کی جنگ شاید اتنی سخت ہو جائے کہ جب ان کا آخری معرکہ ہو تو دونوں اتنے نڈھال اور شکستہ ہو چکے ہوں کہ ایک دوسرے کو لے ڈوبیں یعنی نہ سیاسی وحدت رہے اور نہ مغربی تہذیب۔ یہاں مجھے شیکسپیئر کے الفاظ یاد آ گئے۔

"Like two spent swimmers who cling to each other and choke their art to death."

(Macbeth)

''جیسے دو بہت تھکے ہوئے تیراک ایک دوسرے کو لپٹ جائیں اور اپنے فن کے باوجود ایک دوسرے کو ڈبو دیں۔''

اس ضمن میں اقبال نے کیا خوب کہا ہے!

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانا بنے گا، ناپائیدار ہو گا

4۔ ایک اور ممکن صورت (Possibility) یہ بھی ہے کہ مغربی تہذیب ٹائن بی کے مطابق پوری ''انسانیت کے اتحاد کے بت کی پرستش شروع کر دے۔'' اس کے کچھ آثار زمینی گاؤں (Global

Village) کے روپ میں ابھرنے لگے ہیں۔ یہ ممکن ہے کچھ عرصہ بعد عام ملک اپنی انفرادی' مذہبی اور تہذیبی حیثیت کو ختم کر کے ایک سیکولر چارٹر (Charter) پر متحد ہو جائیں۔ اگر دو یا تین سو سال کے بعد ایسا ہو گیا تو پھر بھی مغربی تہذیب کے روحانی خلاء کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اور یہ روحانی خلاء اگر مزید بڑھتا گیا تو مغربی تہذیب کا BreakDown یقینی ہو جائے گا۔ یہاں وضاحت ہو جائے کہ مختلف ممالک اور قوموں میں نظریاتی اختلافات کے علاوہ معاشی وسائل پر قبضہ کرنے کی جنگ اور منڈیوں کے حصول کی جنگ چلی آ رہی ہے اس لیے گلوبل گاؤں کی ممکن صورت فی الحال بعید القیاس نظر آ رہی ہے۔ یہ جنگل بہت چھوٹا ہو جائے گا اور اتنے چھوٹے جنگل میں یہ کیسے ممکن ہو گا کہ بھوکے شیر گیدڑوں کو چھوڑ دیں۔

5۔ ایک اور صورت میں انسانیت کے اتحاد کا بت بنانے کی بجائے مغربی تہذیب' روحانیت اور مذہب کے طرف لپکے گی مگر سیاسی وحدت ختم ہو گی اور ملک ٹوٹ جائیں گے (کیونکہ سیکولرازم اپنی موت مر چکا ہو گا) لیکن اس روحانی Resurrection کے باوجود' یعنی اگر مغربی فرد روحانی طور پر دوبارہ زندہ ہوتا ہے تب بھی غالب امکان یہ ہے کہ مغربی تہذیب ٹوٹ جائے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس وقت مغربی تہذیب لادینی (سیکولر) بنیادوں پر قائم ہے۔ روحانیت (مذہب) لادینیت (سیکولرازم) کی جگہ لے لے گا تو مغربی تہذیب کا خاتمہ ہے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ مغربی لوگ صدیوں آپس میں مذہبی جنگیں لڑتے رہے ہیں۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان اور چرچ اور سٹیٹ کے درمیان' اور ان مذہبی جنگی نتائج کو دیکھ کر ہی ٹائن بی دلبرداشتہ ہو کر کہتا ہے کہ مغربی قوموں نے ایک خدا کو چھوڑ کر قومیت کے بت کی پوجا کرنی شروع کر دی ہے۔ اب اگر مغربی انسان کسی ایک مذہب جیسے کہ اسلام کو اپنانے کے علاوہ اپنے اپنے انہی مذاہب کی طرف لوٹتا ہے تو ''بوتل میں بند تمام جن باہر آ جائیں گے'' پھر نہ صرف سیاسی وحدت ختم ہو گی اور ملک ٹوٹیں گے بلکہ ایک مرتبہ پھر مغربی تہذیب گروہوں میں بٹ جائیں گی۔ اور پھر مذہبی جنگیں قدرتی بات ہے۔ میرے اس تجزیے کو کچھ لوگ محض پسندیدہ خیالات کی دوڑ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو معجزات کی بات ہے لیکن ایسا ہے نہیں۔

تیری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا میری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا

(اقبال)

یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مغربی تہذیب کا زوال (BreakDown) شروع ہو چکا ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کا زوال (BreakDown) مستقل قریب میں واقع ہو جائے گا۔ غرض جس زاویہ سے بھی دیکھیں مغربی تہذیب کا خاتمہ (BreakDown) دکھائی دیتا ہے۔ مگر ہمارے لیے اہم اور فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا مغربی تہذیب خود خاتمے سے پہلے اسلامی تہذیب کو ضم کر لے گی یا اسلامی تہذیب اس سے بچ نکلے گی۔ اس کا آسان اور صحیح واضح جواب یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا ختم ہونا مغرب کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود مسلمان کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا دین دیا ہی نہیں جسے دوسرے ختم کر سکیں۔ یہ اسی وقت ختم ہو گا جب خود دین والے اسے ختم کریں گے۔ اگر مسلمان چاہے گا تو اسلامی تہذیب زندہ و قائم رہ کر مغربی تہذیب کے تابوت کو زمین میں دفن ہوتا دیکھے گی۔ اور اگر مسلمان اپنی تہذیب کو زندہ رکھنا نہ چاہیں تو مغرب والے اسلامی تہذیب کے جنازے کو قبر میں رکھ کر مٹی ڈال دیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو قائم و دائم رکھنا مسلمانوں کے لیے ذرہ برابر بھی مشکل نہیں۔ مسلمان کو صرف اور صرف یہ کرنا ہے کہ محمد ﷺ کی سنت کو اپنائے رکھے۔ اگر مسلمان صرف اتنا بھی نہیں کر سکتا تو اس دنیا میں اپنی ذلت اور رسوائی و تباہی تو وہ دیکھ ہی رہا ہے۔ غالب امکان ہے کہ اگلے جہان میں بھی جہنم کی آگ ہی دیکھے گا اور حضور ﷺ کی شفاعت کے انتظار میں رہے گا۔ واسطہ پھر بھی اسے محمد ﷺ سے ہی پڑے گا۔ کیا احسان کر گیا اقبال'' کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں'' جس نے اپنے نبی سے وفا نہ کی' اس کی سنت کو اپنانا پسند نہ کیا' مناسب ہی نہ جانا' ضرورت ہی نہ سمجھی' اس کی تباہی میں شک کرنے والے کو چاہیے کہ رسولِ عربی ﷺ پر اتارا جانے والا قرآن مجید فرقان حمید غور سے پڑھے او راپنے لیے راستہ کا تعین از خود کرے۔

انسانی تاریخ میں حضرت نوحؑ سے لے کر اب تک تمام جھگڑا اور فساد ہی 'حاکمیت' کا رہا ہے کہ حاکم کون ہے؟ مقتدر اعلیٰ کون ہے؟ طاقت کا سرچشمہ کون ہے؟ حکومت کس کی ہو گی؟ قانون کس کا ہو گا؟ حق اور ناحق کا تعین کون کرے گا؟

حاکمیت: مسلمانوں کو تو کوئی شک ہی نہیں کہ حاکمیت تو اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ وہی مقتدر اعلیٰ ہے وہی طاقت کا سرچشمہ ہے' وہی قانون دینے والا ہے اور محمد ﷺ اللہ کے پیامبر اور ہمیں یہ قانون سکھانے والے' عمل درآمد کروانے والے ہیں۔ سورۃ نمل آیت نمبر 61 کا ترجمہ ہے۔

''اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کیساتھ۔ کوئی نہیں' بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں۔''

حاکمیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہمیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ ''بہتوں کو ان میں سمجھ نہیں''' یعنی اکثریت کو سمجھ نہیں اور اکثریت نہیں مانے گی۔ اس سے نظریہ اکثریت کی بھی نفی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فرما دیا کہ اکثریت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو نہیں مانے گی۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پچھلی قوموں کے حالات و اطوار اور اعمال بیان فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکار کی موجودہ صورت ہم نظریہ جمہوریت کی شکل میں دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ اسی سورۃ کی آیت نمبر 62 میں ہے۔

''اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ؟ تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔''

آگے ہے۔

''اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ؟ اللہ اس سے بہت اوپر ہے اس سے جس کو تم شریک بتلاتے ہو۔''

جمہوریت انسان کو شریک بتلاتی ہے۔ یقیناً اللہ اس سے بہت اوپر ہے۔ اگلی ہی آیات نمبر 64 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''اب کوئی حاکم ہے اللہ کے ساتھ؟ تو کہہ لاؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو۔''

ہزاروں صدیاں گزر گئیں سند آج تک کوئی نہیں لا سکا۔ کیا جمہوریت کا یہ نظریہ شرک نہیں؟ یقیناً ہے۔ اکثریت کی حاکمیت کیسے ہوسکتی ہے۔ سند کون لائے گا؟ اور کہاں سے آئے گی؟ سورۃ اعراف آیت نمبر 188۔

''تو کہہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے۔''

انسان اپنی حاکمیت کی کیا سند لائے گا وہ تو اپنی جان کا بھی مالک نہیں، حاکم نہیں۔ عجیب بات ہے حضور ﷺ تو یہ سکھائیں کہ ''میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے اور برے کا'' اور حضور ﷺ کے امتی یہ کہیں کہ 'حاکمیت' ہماری ہے؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ اگلی آیت جمہوری نظام کی دھجیاں اڑا دیتی ہے۔ سورۃ یوسف آیت نمبر 40۔

''حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے۔ اس نے فرمادیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو۔ یہی ہے راستہ سیدھا پر بہت لوگ (اکثر لوگ) نہیں جانتے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اُتری ہی جمہوری نظام کے خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہاں اکثریت سے مراد کفار کی ہے کیونکہ کفار ہی شرک کرتے ہیں اور غیر اللہ کو پوجتے ہیں اس کا فیصلہ بھی سورۃ یوسف میں ہو جاتا ہے۔ سورۃ یوسف کی آیت نمبر 106۔

''اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ (لوگوں کی اکثریت) اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں۔''

یہاں اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد بھی، مسلمان بننے کے بعد بھی، یعنی کلمہ پڑھنے کے بعد بھی اکثر لوگ شرک کرتے ہیں۔ وہ تمام مسلمان اس آیت کی زد میں آتے ہیں جو ایمان لانے کے بعد بھی جمہوری نظام کے تحت انسان (اکثریت) کو حاکم مانتے ہیں۔

اب بتائیں انسان کی حاکمیت کہاں گئی۔ اور نظریہ اکثریت کہاں گیا۔ سورۃ القصص میں ہے:

''سو مت ہو مددگار کافروں کا اور نہ ہو کہ وہ تجھ کو روک دیں اللہ کے حکموں سے۔''

(آیت 87-86)

اس میں یقیناً شامل ہے کہ کفری نظریہ جمہوریت کی تائید وحمایت نہیں بلکہ شدید مخالفت کرنی چاہیے۔ اسی جگہ آگے ہے۔

''اور مت ہو شرک والوں میں۔'' (آیت 87)

''اور مت پکار اللہ کے سوا دوسرا حاکم۔'' (آیت 88)

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

''مت ٹھہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم۔ پھر بیٹھ رہے گا تو الزام کھا کر بے کس ہو کر۔''

(آیت 22)

کافر شرک میں ڈوبے تو اگلا جہاں برباد ہوتا ہے مسلمان شرک کرنے لگے تو اس کے دونوں جہان برباد ہو جاتے ہیں۔ یہی مسلمان ملکوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے لیے ہر آنے والا دن پریشان کن اور مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

اب ایک نظر کفار کے سردار (یعنی فرعون پر)۔

سورۃ النّٰزعٰت آیت نمبر 23, 24 میں ہے۔

''پھر (اس نے) سب کو جمع کیا، پھر پکارا تو کہا میں ہوں تمہارا ربّ سب سے اوپر۔''

یعنی سب سے بڑا ربّ تو میں (فرعون) ہوں۔ یہ موسیٰ (d) کس کا بھیجا ہوا ہے۔ فرعون نے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا۔ جمہوریت میں بھی انسانوں نے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا۔ اللہ نے فرعون کو قیامت تک کے لیے نمونہ (نشان عبرت) بنا دیا۔ ہم بھی فی الحال کسی نمونے سے کم نہیں لیکن ہمارے پاس ابھی کچھ وقت ہے ہم ابھی مرے نہیں۔

سورۃ الانفال آیت نمبر 21-20 میں ہے۔

''اے ایمان والو۔ حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس سے مت پھرو سن کر۔ اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور نہیں سنا۔''

افسوس جمہوری نظام کے مسلمان لوگ بھی انہی میں سے ہیں ''جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا در حقیقت انہوں نے سنا نہیں۔'' وہ انسان جو اپنے آپ کو مقتدر اعلیٰ اور حاکم کہلاتا ہے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور ہم عاجز نہیں اس بات سے کہ بدلہ میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اُٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں جہاں تم نہیں جانتے۔'' (واقعہ آیت نمبر 61)

یہ وقعت ہے اس انسان کی جو خود کو حاکم سمجھے ہوئے ہے۔لیکن افسوس ہم نے اپنے اللہ کو نہیں پہچانا۔اور کچھ لوگوں نے حق کا معیار اپنی عقل کو بنا رکھا ہے۔ جہاں عقل استعمال کرنی چاہیے وہاں استعمال نہیں کرتے۔**مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی سب سے بالا ہستی سرور دو جہان سردار انبیاء سراج المصطفیٰ ﷺ کو طاقت کا سرچشمہ نہیں بنایا تو ہم کیسے طاقت کا سرچشمہ ہو سکتے ہیں۔** ساری دنیا کے انسان کفار اور مسلمان جنات وحیوان اکٹھے اور متحد ہو جائیں تو بھی طاقت کا سرچشمہ نہیں ہو سکتے۔جو یہ کہتے ہیں کہ طاقت کا سرچشمہ لوگ ہیں اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں وہ کفر اور شرک کی بات کرتے ہیں۔مسلمانوں کو کم از کم یہ سوچنا چاہیے کہ ایسا نظریہ رکھنے اور کہنے سے ہمارے پیغمبر محمد ﷺ کی شان میں گستاخی بھی ہوتی ہے۔جو شخص یہ جانتے ہوئے کہ جمہوریت لادینیت ہے ایک شرکیہ نظریہ اور نظام ہے۔

جمہوریت خاشاک کا تو وہ نہیں عذاب کا تو وہ ہے۔مسلمانوں کو اسے سمجھنے میں بہت مغالطہ ہوا ہے۔دراصل پہلے ذرائع ابلاغ اتنے وسیع نہیں تھے ہمارے علماء کو علم ہی نہ ہو سکا کہ جمہوریت کیا ہے۔اب ہمارے پاس غلطی کا جواز نہیں۔

سورۃ المائدہ آیت نمبر 77:

''اور مت چلو خیالات پر ان لوگوں کے جو گمراہ ہو چکے پہلے اور گمراہ کر گئے بہتوں کو اور بہک گئے سیدھی راہ سے۔''

اکثریت: پہلی بات کہ حق وہ ہے جو کل حق تھا آج بھی حق ہے اور آئندہ تا قیامت حق ہی رہے گا۔سچ وہ ہے جو حضرت آدمؑ سے آج تک سچ ہے اور قیامت تک سچ رہے گا۔کیونکہ سچ بتانے والا اللہ ہے۔لوگوں کی سوچ اور انداز تو بدل سکتے ہیں بدلتے رہے ہیں' بدل رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔حق اور سچ کبھی بدلے ہیں نہ بدلیں گئے۔حق وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ حق کہیں۔ حق کا معیار حضور ﷺ کی زبان مبارک ہے۔لوگوں کی رائے' اکثریت کی رائے پہلے کبھی حق کا معیار تھی آج ہے اور نہ کبھی آئندہ ہوگی۔بلکہ اس کے برعکس قرآن میں پچاسی سے زیادہ آیات مبارکہ ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی اکثریت کی مذمت کی ہے۔اکثریت کی مذمت میں قرآن میں مختلف مقامات پر آیا ہے کہ اکثر لوگ فاسق' جاہل' ظالم ہوتے ہیں' سمجھ نہیں رکھتے' غور نہیں کرتے۔قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اگر وہ یقین رکھتے اللہ پر اور اپنے نبی پر اور جو نبی پر اترا تو کافروں کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں بہت سے لوگ نافرمان ہیں۔''

منع اس لیے کیا گیا کہ مشہور مثل ہے خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔یہودی ایسے ہی برباد ہوئے کہ بت پرستوں سے تعلقات رکھتے تھے۔

ہم جمہوریت کو پکڑنے میں رنگ پکڑنے سے بھی آگے نکل چکے ہیں مغربی تہذیب کے اس نظریہ کو صحیح جان کر بلکہ ناگزیر سمجھ کر ان کی تقلید کر رہے ہیں۔آپ بتائیں اللہ تعالیٰ تو اکثریت کو فاسق اور جاہل' نافرمان اور ناسمجھ کہے اور ہم اسی اکثریت یعنی اکثریت کفار یعنی مغربی تہذیب کے 'نظریہ اکثریت' کو حق کا معیار کہیں۔تو ایسی صورت میں ہماری بربادی لازمی ہوگی یا نہیں؟

اس آیت میں کہ ''اکثر لوگ نافرمان ہیں'' یہ پتہ چلتا ہے کہ اکثریت شیطان کے نرغے میں ہوتی ہے۔اکثریت بہکی ہوئی ہوتی ہے۔اکثریت پر شیطان حاوی ہوتا ہے اور میرے جمہوریت نواز احباب ایسی ہی اکثریت کو حق اور فیصلے کا معیار سمجھتے ہیں اور میرے بہت سے دوست ایسی ہی اکثریت کے ذریعے اسلام کے نفاذ کے خواب دیکھتے ہیں۔

اکثریت کی اس حق نوازی کا یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات اسمبلیوں میں اقلیتوں کے ممبرز کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور اسلامی جماعتوں کے ممبرز کی تعداد کم۔ایک مرتبہ پھر سورۃ یوسف کی آیات نمبر 106 بیان کروں گا۔

''اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ (اکثریت) اللہ پر مگر ساتھ شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔''

دوسرے الفاظ میں لوگوں کی اکثریت کلمہ بھی پڑھتی ہے اور شرک بھی کرتی ہے اس کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی m تفسیر عثمانی میں لکھتے ہیں۔

''اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا سننا اور دیکھنا محض سرسری ہے۔آیات اللہ میں غور وفکر کرتے تو کچھ فائدہ پہنچتا تھا۔جب دھیان ہی نہیں (قرآنی آیات پر) تو ایمان کہاں سے ہو۔''

آپ فیصلہ کیجیے' اللہ تعالیٰ ایمان والوں میں اکثریت کی یہ کیفیت بتا رہے ہیں اور ہم اپنے معاملات میں اکثریت کو حاکم بنا رہے ہیں ان سے حاکمیت منسوب کر رہے ہیں ان سے قانون سازی کروا رہے ہیں ان لوگوں کے درمیان اقتدار کا فیصلہ کروانے پر تلے ہوئے ہیں۔

سورۃ انعام آیت نمبر 116 میں ہے۔

''اگر تو کہا مانے گا اکثر لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھ کو بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے وہ سب چلتے ہیں اپنے خیال پر اور سب اٹکل ہی دوڑاتے ہیں۔''

اکثریت کی مذمت میں اور اکثریت کی رائے پر چلنے کے خلاف قرآن میں اور بھی آیات ہیں۔

ووٹنگ سے مسائل کو حل کرنا رائے قبول کرنے سے بھی بڑھ کر ہے۔ووٹ رائے نہیں ہوتا ووٹ فیصلہ ہوتا ہے جسے قبول کرنا ہوتا ہے ووٹوں کی اکثریت کو رد نہیں کر سکتے۔

قرآن میں ہے''(اے نبی ﷺ) تو کہہ (ان لوگوں سے پوچھ) کیا برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور بے سمجھ۔سوچتے وہی ہیں جن کو عقل ہو۔'' (الزمر آیت 9)

یہ الفاظ بہت وسیع مفہوم رکھتے ہیں زندگی کا کوئی پہلو اس آیت سے باہر نہیں مگر ''سوچتے وہی ہیں جن کو عقل ہو''۔ اور عقل ایسے نظریے کو کیسے درست مان سکتی ہے جس میں عالم اور جاہل کی رائے کو برابر رکھا جائے۔

''گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کار شو کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید''

اقبال نے کیا خوب کہا جمہوریت سے نکل بھاگ دانائے راز اور پختہ کار کی پیروی کر کیونکہ دو سو گدھے مل کر بھی وہ بات نہیں سوچ سکتے جو کسی ایک انسان کی عقل میں آسکتی ہے۔

'حق' جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے دائمی ہوتا ہے جب کہ لوگوں کی سوچ کا معیار بدلتا رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تنزل پذیر ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ اور رائے پر کئی درجنوں عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر عوام کا تعلیمی معیار لوگوں کی معاشی حالت' جاگیرداری' کنبہ' ذات برادریاں موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ اور متعدد حکومتوں کی پالیسیاں اور رویے وغیرہ وغیرہ اکثریت کی رائے اکثر اوقات ''چلو اس طرف کو جدھر کی ہوا ہو'' کا شکار ہو جاتی ہے اور بعض اوقات دشمن کا پھیلایا ہوا پروپیگنڈا سنگین حالات پیدا کر دیتا ہے۔ ہم دشمن کی نفسیاتی جنگ کے اثرات اور نتائج سے بخوبی واقف ہیں جیسا کہ 1971-1970ء میں مشرقی پاکستان میں ہوا۔

معاشرے کی اقدار گرتی چلی جاتی ہیں۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ میرا زمانہ سب سے اچھا زمانہ ہے۔ یعنی حضورﷺ نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر ہم تک پہنچا دی کہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اعمال اور افعال بگڑتے چلے جائیں گے۔ یہ ایک عقلی دلیل بھی ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ کیسے ممکن تھا کہ حضورﷺ حق کا معیار لوگوں کی رائے کو کہہ جائیں یا یہ کہہ جائیں کہ اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلے کر لیا کرو۔

اگر قرآن وحدیث یہ اجازت دے دیتے کہ دنیا کے معاملات نبٹانے کا معیار اور حق کا معیار اکثریت کی رائے ہو سکتے ہیں اور عدلیہ' انتظامیہ اور (Legislature) اکثریت کی رائے کے مطابق ڈھالے جا سکتے ہیں تو انسان کو اپنی مرضی کرنے کا لائسنس اور سرٹیفکیٹ مل جاتا کہ وہ جہاں چاہے جب چاہے کثرت رائے سے اپنے قوانین بنالے اور اپنی اقدار قائم کر لے۔ اللہ تعالیٰ کی اس اجازت کے بعد انسان جو کچھ بھی کرتا وہ حق بجانب ہوتا۔ قیامت کا اور روز جزاء کا تصور ہی ختم ہو جاتا۔ پکڑ کس بات کی ہوتی۔ پھر یہ تمام پیغمبر اور آسمانی کتب بے معنی سے ہو کر رہ جاتے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس میں بال برابر بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ جمہوری نظام کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

مسلمان حاکمیت صرف خدا واحد کی مانتا ہے' اس کا آئین قرآن اور سنت ہیں اور فیصلے اکثریت کی بجائے قرآن اور سنت کی روشنی میں کرتا ہے۔ تو اسے اس شرکیہ نظام میں پڑ کر جہنم کا ایندھن بننے کی کیا ضرورت ہے۔ اسلام کا نفاذ جمہوری طریقے سے نہیں صرف سنت کے طریقے سے ہی ہو سکتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی سنت کے طریقے کے مطابق ہوگا تو اللہ کے ہاں قابل قبول ہوگا۔

امریکی صدر ٹرومین (Truman) نے ایک مرتبہ کہا:

"There is no harm in walking with the Devil to cross over the bridge."

ترجمہ: ''یعنی پرلے کنارے پر جانے کے لیے اگر شیطان کے ساتھ بھی پل پار کرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔''

مغرب زدہ ذہن ابدی نظام حیات کو چھوڑ کر مغربی جمہوریت کی اندھی تقلید کرنے والے دریائے مسسپی (Mississippe) اور کولوریڈو (Colorado) کے پل تو اس بیان کی روشنی میں پار کر سکتے ہیں لیکن جنت کے راستے کا واحد ''پل صراط'' ہے۔ صراط مستقیم اس لیے وہ افراد' گروہ یا جماعتیں کوئی جمہوریت کو پل بنا کر جنت میں جانے کی توقع کرتے ہیں تو وہ اس حقیقت کو نہیں جان پائے کہ 'صراط مستقیم' کسے کہتے ہیں کیا انہیں یقین ہے کہ وہ پیغمبروں' صدیقین' صالحین اور صحابہ j کے راستہ پر ہیں؟ کیا کوئی ایسی مثال ہے کہ کسی پیغمبر' کسی صدیق' کسی صحابی نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کے لیے صالحہ افراد کی جانیں بچانے کے لیے' حفاظت کے لیے شرکیہ راستہ اختیار کیا ہو؟ ہمیں حضورﷺ کا فرمان ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ تمام فرقے (تمام لوگ) جہنم میں جائیں گے سوائے جو اس طریقے پر ہوگا جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے۔ ''ما انا علیہ واصحابی'' یہ ہے سنت کا مفہوم ''واصحابی'' سے جماعت صحابہ مراد ہیں۔ جب دینی عالم جمہوری نظام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے تو امت کی گمراہی یقینی بات ہے۔ گزارش ہے کہ ہمارے علماء سیاست و جمہوریت سے مکمل طور پر نکل آئیں اور لوگوں میں دل و جان سے فہم قرآن پیدا کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیں تو جو دین 50 سالوں میں اس ملک میں نہیں آیا انشاء اللہ تعالیٰ 10 سالوں میں رائج ہو جائے گا۔ اگر 'فہم القرآن' کا فریضہ ہم صحابہؓ کے جذبہ سے اپنا لیں یا کم سے کم' لگن کا مظاہرہ کریں تو انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے۔

ہر فرد کی ذمہ داری

۱۔ ہم مسلمان ہیں اس پر فخر کرنا چاہئے اور سچے مسلمان کی طرح Behave کرنا چاہئے یعنی ہمارے کردار میں' اخلاق میں' گفتار میں خوف خدا اور اتباع رسولﷺ ہونا چاہیئے۔

۲۔ تمام دینی جماعتوں' علماء اور دینی لوگوں کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہر شہر میں' ہر علاقہ میں' ہر محلّہ میں' ہر گلی میں' لوگوں میں قرآن فہمی پیدا کریں۔ مسلمانوں کا قرآن سے تعلق قائم کریں خاص طور پر حقوق العباد کی تعلیم اور انہیں پورا کرنے کی تلقین کریں۔

۳۔ اسوہ رسولﷺ' رسول کی تمام سنتوں کو ہم جان کی طرح عزیز رکھیں ان کی تمام دُعائیں یاد کریں' ہر موقع پر پڑھیں اور ہمارا ہر قدم رسولﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔ ہماری تہذیب' ہماری امت کی بقاء' زندگی اور فلاح اسی میں ہے۔

۴۔ تعلیم، تعلیمی اداروں میں ہے لیکن بچوں کی دینی تربیت مکمل طور پر والدین کا فریضہ ہے ہر والد اور والدہ سے روز قیامت اپنی اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر جہاد نہیں کر سکتے، دعوت و تبلیغ میں حصہ نہیں لے سکتے، صدقہ و خیرات کی گنجائش محسوس نہیں کرتے کم از کم ہر فرد اپنے گھر سے ٹی وی اور کیبل ختم کر کے بچوں کی صحیح تربیت تو کر سکتا ہے اور یہ کہ بچے والد یا والدہ کی موجودگی میں انٹرنیٹ پر بیٹھیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کو اکیلے انٹرنیٹ پر نہ بیٹھنے دیا جائے۔ موبائیل کے بغیر بھی لڑکے اور لڑکیاں کا گزارہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان مرد اپنے گھر کو بھی درست نہیں کر سکتا تو وہ دونوں جہانوں میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے مکمل تیاری کرے۔ اگلے جہاں میں عذاب الٰہی اور اس جہاں میں ذلت اور تباہی۔

اور بھی بہت سی چیزیں ہیں، اگر ہماری دینی جماعتیں جمہوریت کی بجائے یہ راستہ اختیار کریں تو انشاء اللہ دس سالوں میں اس ملک کا مقدر بدل سکتا ہے۔

آپ جان چکے ہیں کہ جمہوریت کے بل بوتے 50 سال تو کیا سو سالوں میں بھی اسلام نہیں آ سکتا بلکہ شر ہی شر آئے گا، جمہوریت جائے گی تو خلافت دوبارہ آئے گی اور جو حضرات جمہوری نظام میں شامل ہیں وہ اس شر کیہ اور کفریہ نظام کو قائم رکھنے میں برابر کے حصہ دار ہیں انہوں نے خلافت کا راستہ روکا ہوا ہے اور اس کا تمام بوجھ ان کے کندھوں پر ہے۔

''اور جس نے کی ذرہ برابر بھی برائی تو وہ دیکھ لے گا اس کو۔'' (سورۃ زلزال)

اجر کے لیے یہ ضروری ہے کہ کام نیک ہو، صرف رضائے الٰہی کے لیے کیا جائے اور سنت کے طریقہ پر کیا جائے۔ یہ اللہ کی شرائط ہیں کسی بھی عمل کی قبولیت کیلئے۔

غلط فہمی

ہمارے کچھ پڑھے لکھے افراد نے عام لوگوں کو یہی تصور دیا ہے۔ ایسی باتیں کی جاتی رہی ہیں۔ لوگوں کو خلافت راشدہ کے دور سے مثالیں دے کر اور مختلف واقعات بیان کر کے بتایا جاتا رہا ہے کہ وہ ایک مکمل طور پر جمہوری دور تھا، جمہوریت اسلام کا جز ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تضاد نہیں بلکہ جمہوریت عین اسلام ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ایک تو ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے صحیح پڑھنے والے 15 فیصد سے بھی کم ہیں۔ اور جو افراد کچھ پڑھنے والے ہیں وہ تو بہادر شاہ ظفر سے معذرت کے ساتھ

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن کچھ کھیل میں کٹ گئے کچھ روزگار میں

یعنی

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں اس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی

اس لیے وہ اسلامی تاریخ سے اتنے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ نتیجتاً وہ ایسی باتیں بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے جمہوریت کے جواز میں قرآن سے بھی آیات پیش کی ہیں۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

(اقبال)

ایسی باتیں اس وقت زیادہ ہوئیں جب ہماری دینی سیاسی جماعتیں کفر کی طرف بہتے ہوئے لوگوں کو نکالنے کے لیے جمہوریت کے دریا میں اتریں۔ لیکن اس ملک میں صاحب علم، صاحب حق، فہم اور فراست والوں کی بھی کمی نہیں۔ اس قسم کے غلط خیالات کی رد میں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، بہت لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔

مشکل ہے کہ بندہ حق بین، و حق اندیش خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

(اقبال)

مثال کے طور پر عبدالرحمٰن کیلانی صاحب نے ایسے ہی شکوک دور کرنے کے لیے خلافت و جمہوریت، کے نام سے مکمل اور محققانہ کتاب لکھی ہے۔ اسی طرح صاحب زادہ مرحوم خورشید احمد گیلانی، کرنل ڈاکٹر غلام فرید بھٹی صاحب، پروفیسر حافظ محمد عبداللہ مرحوم بہاولپوری اور ہمارے بزرگ ڈاکٹر اسرار صاحب کی جمہوریت اور اسلام پر بڑی مدلل تحریریں اور مباحث موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس موضوع پر لوگوں کی بہت رہنمائی کی اور شر اور حق کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا نظریہ جمہوریت اور اسلام ایک چیز ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تمام مغربی ممالک میں اسلام کا نفاذ ہو چکا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیے کہ مغربی اقوام نے اسلام پر مبنی نظام کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن یہ ماننا مشکل ہے کیونکہ ابھی تک حضرت عیسیٰؑ کا نزول نہیں ہوا پھر یہ کہ اگر اسلام عین جمہوریت ہے تو کرہ ارض پر موجود سب سے بڑے چوہدری (امریکہ) نے طالبان کا ''حقہ پانی'' کیوں بند کیا ہوا ہے؟ یہ ماننا مشکل ہے۔

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

اب ان لوگوں کا بیان جو کہتے ہیں اسلام میں جمہوریت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت اسلام کا جز و ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ تمام لوگ جو ''کل'' یعنی اسلام کو چھوڑ کر ہر طرف ایک 'جز' جمہوریت کی رٹ لگا رہے ہیں ان کی عقل اور نیک نیتی پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے سیاست دانوں کو چاہیے کہ ہمیں اصل بات بتا دیں کہ وہ 'کل' کو چھوڑ کر ایک حصے اور 'جز' کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی جمہوریت جس حصے کے پیچھے پڑ جائے اسے کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جیسے مشرقی پاکستان اور انڈونیشیاء میں عیسائی جزیرہ (East Timore) لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی سچ تو بولے۔

اگر کوئی حکمران بغیر الیکشن کروائے مکمل طور پر اسلامی عدل و انصاف اور مساوات کا نظام قائم کر دے جس میں سیاستدانوں کو کوئی وزارتیں اور عہدے نہ ملیں تو بھی وہ جمہوریت کی بحالی کا نعرہ لگاتے رہیں گے۔ کوئی فرشتہ سیرت عوام کو تمام سہولیات دے اور ملک کو معاشی استحکام دے لیکن پھر بھی ہمارے بھائی جمہوریت کی بحالی کے لیے لوگوں سے تن، من، دھن کی بازی لگوا دیں گے۔ جمہوریت کی

بحالی ان کی نظر میں اس وقت ہوسکتی ہے جب ملک میں ہر تین یا پانچ سال بعد نام نہاد انتخابات ہوں اور باری باری سب کو اقتدار ملتا رہے۔ درحقیقت اقتدار کے بھوکے یہ لوگ بار بار کے انتخابات کو جمہوریت کہتے ہیں۔ اپنی تمام تقاریر میں عام طور پر جب یہ کہتے ہیں کہ جمہوریت اور اسلام ایک چیز ہے تو اسلام کے عدل وانصاف' مساوات اور شخصی آزادی کو جمہوریت کی دلیل بناتے ہیں لیکن جب اسلامی جمہوریت کے نام کی آڑ میں جمہوریت کا نعرہ لگاتے ہیں تو مقصد صرف انتخابات یعنی اب کرسیوں کی بندر بانٹ دوبارہ ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھے لکھے آدمی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت صرف نئی اسمبلیاں بنانے اور حکومت تبدیل کرنے کا نام ہے۔ افسوس کہ

بار بار لوٹو' ہزار بار لوٹو ہے لوٹنے کا مال' یہ ملک خداداد

لیکن ایک آپ ہی سے گلہ نہیں ہم کو۔ کارلائل کہتا ہے۔

''آپ خود کو دیانت دار بنالیں اور یقین کرلیں کہ دنیا میں ایک بے ایمان کی کمی ہوگئی ہے۔''

جمہوریت کے احسان

جمہوریت اور انسانی حقوق کی علمبردار حکومت امریکہ جس کے ہاتھوں پر اقوام عالم کے معصوم لوگوں کا خون ابھی تک خشک نہیں ہوا' اور مغرب نے افغانستان' عراق' سوڈان میں جو کچھ بھی کیا اقوام عالم اس سے بے خبر نہیں' آگ وبارود کی بارش کرنے والوں کے ایما پر ورلڈ بنک' بین الاقوامی مالیاتی ادارے اور ان کے دوسرے گماشتے مختلف حیلے بہانوں سے پاکستان میں جمہوریت کا راگ الاپتے رہتے ہیں حالانکہ پس پردہ ان کے عزائم کس قدر گھناؤنے ہیں وہ بھی مہذب دنیا جانتی ہے۔

طاقت کا سرچشمہ امریکی عوام کے ایک نمائندے صدر ٹرومین کا ایک بہت 'پیارا' اصول تھا' دوبارہ عرض کررہا ہوں۔

"There is no harm in walking with the Devil to cross over the bridge."

''پل سے گزرنے کے لیے شیطان کے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں' اور جمہوری سیاسی پارٹیوں سے بہتر اس قول کو کون سمجھتا ہے۔ بڑی 'ایمانداری' سے ہر الیکشن میں اس پر عمل کرتے ہیں۔

مقتدر اعلیٰ عوام کا ذکر ہوا۔ امریکہ کی مقتدر اعلیٰ (Sovereign) عوام نے جاپان کے دو شہروں کے صنعتی علاقوں کے ایک لاکھ مرد بوڑھے عورتیں بچے یہاں تک کہ شیر خوار بچے چشم زدن میں ہلاک کرڈالے کہ آنے والی نسلیں بھی یاد کرتی ہیں' حالانکہ امریکی جنرل ڈگلس مکارتھر (Douglas Macarther) کا کہنا تھا کہ امریکہ ایٹمی ہتھیار استعمال کیے بغیر بھی یہ جنگ جیت سکتا تھا لیکن ان سے جو اس وقت وہاں اتحادیوں کی فوج کے سپریم کمانڈر تھے' ان کے کہنے کے مطابق مشورہ تک نہ کیا گیا۔

ویسے ہٹلر کو بھی مقتدر اعلیٰ عوام نے بڑی زبردست اکثریت کے ساتھ ملک کا سربراہ بنایا تھا۔ اسی طرح اٹلی کا مسولینی بھی زبردست مینڈیٹ (Mandate) کے ساتھ انتخابات میں کامیابی کے بعد سربراہ بنا تھا۔ یہ دونوں جمہوریت کے ذریعے اقتدار میں آئے۔ کروڑوں لوگوں کا خون مقتدر اعلیٰ عوام کی گردن پر ہے۔ لیکن یہ عوامی لیڈر گھبرانے والے نہیں ہے۔ جیسے لیڈی میکبتھ (Lady Macbeth) نے اپنے خاوند میکبتھ (Macbeth) کو غیرت دلائی کیونکہ وہ قتل کرکے پریشان ہورہا تھا۔

"My hands are of your colour but I shame to wear a heart so white."

''یعنی میرے ہاتھ بھی تمہاری طرح خون سے آلودہ ہیں۔ لیکن مجھے تمہاری طرح کمزور دل رکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' یہ سب بے قصور تھے۔ بڑے بڑے لوگ' بل کلنٹن' جیسے' جمہوری نظام کے بنائے ہوئے صدر' لیڈر بے قصور بدنام کردیئے جاتے ہیں۔

ان سب باتوں کا ایک مقصد تھا' کہ طاقت کا سرچشمہ عوام کی اکثریت نے' جمہوری نظام نے' اکثریت سازی نے دنیا کے بدترین لیڈر مہیا کئے' جنہوں نے انسان کو دنیا کے سب سے بدترین دن دکھائے ہیں۔ اتنا خون بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جمہوری نظام اور اسلامی نظام میں بڑا فرق ہے۔

کلیسائی حکومتوں (Parochial States) نے اتنا خون بہانے کے بعد کسی پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا۔ از راہ تفنن عرض کررہا ہوں۔

ایک آدمی ذہنی امراض کے ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب میرا کچھ علاج کیجیے۔ میں گناہ کر بیٹھتا ہوں اور بعد میں بہت پچھتاتا ہوں میرا ضمیر بہت ملامت کرتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا ''اچھا' تو اب آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی قوت ارادی اتنی مضبوط کردوں کہ آپ آئندہ گناہ نہ کریں۔'' مریض نے کہا ''نہیں ڈاکٹر صاحب پلیز (Please) میرا ضمیر ماردیں۔'' جمہوری نظام میں لادینیت (Secularism) اور اقتدار کی ہوس ضمیر کو ماردیتی ہیں اس لیے ہر لیڈر بے دھڑک جھوٹ بول سکتا ہے اور ''بے قصور'' ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے جس کا مغرب میں برملا اظہار کیا جاتا ہے کہ ٹاپ لیول (Top level) قیادت غیر معیاری ہوگئی ہے اور اس کی وجہ جمہوری طریقہ انتخاب ہے۔

خلافت کا دور بالکل جمہوری نہیں تھا

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خلافت کا دور سب سے زیادہ جمہوری تھا۔ خلفاء کا چناؤ جمہوری طریقہ سے ہوا کہ وہ فیصلہ اکثریتی رائے سے کرتے تھے اور یہ کہ ملک میں اکثریت کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ کچھ لوگ ایک نہایت ضعیف حدیث بھی بیان کرتے ہیں بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا ''اپنے میں سے بارہ سردار منتخب کرو جو اپنے لوگوں کے ذمہ دار ہوں''۔

مولانا عبدالکلام آزادؒ اپنی کتاب رسولِ رحمت میں تحریر فرماتے ہیں ''مولانا شبلی نعمانی نے اسے حدیث کہا ہے لیکن مجھے یہ حدیث کہیں نہیں ملی''۔ یہ حدیث بغیر کسی حوالے کے بیان کی جاتی ہے اس لئے اس کی صحت نہایت مشکوک ہے۔

دوسری بات کہ عربی قبائل کے سردار صدیوں سے ایک طریقہ کے مطابق منتخب ہوتے چلے آرہے تھے یعنی قبیلے کے بڑے اور بزرگ لوگ ہی اپنوں میں سے سردار منتخب کیا کرتے تھے (عوام، عام لوگوں کا کوئی

رول (Role) حصہ نہیں تھا)۔اس لئے یہ کہنا کہ حضورﷺ نے یہ فرمایا کہ اپنے میں سے سردار منتخب کرو زیادہ سمجھ میں نہیں آتا۔

بجز یہ کہ سردار کا چناؤ بڑے اور بزرگ لوگوں کا فرض تھا اور کبھی بھی لوگوں کا، عوام کا حق نہیں سمجھا جاتا تھا۔اگلی بات کہ نمائندہ وہاں مقرر کیا جاسکتا ہے جہاں 'حق' ثابت ہو جیسے ولی دلہن بیٹی کا نمائندہ ہوتا ہے۔مقدمات میں وکیل ہمارے نمائندے ہوتے ہیں۔یعنی جہاں حق ثابت ہوتا ہے یا حق ثابت کرنے کے لئے ہم نمائندے 'وکیل مقرر کرتے ہیں' چنتے ہیں، انتخاب نہیں کرواتے۔

خلافت کے چناؤ کے سلسلے میں پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ بنائے جانے کا طریقہ کا بیان ہوگا، اسکے بعد انکے بڑے بڑے فیصلے جو تاریخ نے قلم بند کئے انکا ذکر ہوگا اسکے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے خلیفہ بننے اور ایک دو اہم فیصلوں کا تجزیہ (Analysis) پھر حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ کے خلیفہ مقرر کئے جانے کا طریقہ بیان ہوگا اور آخر میں انشاءاللہ ایک مختصر سا تجزیہ۔

خلیفہ اول کی تقرری

حضورﷺ کا وصال ہوا تو کچھ اصحاب رسول تجہیز و تکفین کی تیاری کر رہے تھے۔کچھ اصحاب رسول پریشان حال بیٹھے ہوئے تھے مسجد نبوی میں کچھ اصحاب رسول غم میں ڈوبے بنی ساعدہ پر اکٹھے ہوئے۔یہ قدرتی امر ہے کہ غم و خوشی کی خبر پر لوگ ایسی جگہوں پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔انصار کے دو مشہور قبیلے اوس اور خزرج تھے یہ ڈیرہ (سقیفہ) قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنو ساعدہ کے حضرت سعد بن عبادہh کا تھا۔تاریخ اسلام میں اکبر خان نجیب آبادی لکھتے ہیں مہاجرین کے گھر مسجد نبوی کے علاقہ میں زیادہ تھے۔وہ وہاں جمع ہوئے یہاں انصار کم تھے۔دوسری طرف بازار کے قریب جہاں انصار کے گھر تھے وہاں سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار جمع ہوئے۔یہ سقیفہ مسجد نبوی سے 500 میٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ ان انصار لوگوں میں دو ایک مہاجرین کے علاوہ زیادہ تر بنی ساعدہ ہی کے انصار تھے۔اوس اور خزرج کی تقریباً اڑھائی سو ذیلی شاخوں میں سے بنی ساعدہ بھی ایک شاخ تھی۔حضرت سعد بن عبادہh نے اپنے ساتھیوں سے امر خلافت کے لیے بات کی۔

مدینہ میں وہ آبادی میں زیادہ تھے' یہاں کے اصل رہنے والے تھے اور مہاجروں کو انہوں نے پناہ دی تھی۔مورخین کے مطابق سعد بن عبادہؓ اس لیے جلدی میں تھے کہ انہیں حضورﷺ کا یہ ارشاد معلوم تھا ''جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو دوسرے کو قتل کر دو'' یہاں یہ ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اہل قریش کے دس خاندان تھے۔بنو ہاشم' بنو تمیم' جس کے سردار حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے' بنوں عدی جس کے سردار حضرت عمرؓ تھے۔بنو نوفل' بنو عبدالداز' بنو اسد' بنو جمع' بنو سہیم' بنو امیہ اور بنو مخدوم' مسجد نبوی کے پاس ایک آدمی مغیرہ بن شعبہ نے حضرت عمرؓ کو آواز دی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور تم وہاں جلدی پہنچو اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ کر لیں۔حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے وہاں چلنے کے لیے کہا اور دونوں اس طرف روانہ ہو گئے۔امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ بھی ہمراہ تھے۔راستے میں ان کو دو انصار ملے جو انہی کی طرف آ رہے تھے' اویم بن سادہؓ اور عاصم بن عدیؓ۔ان دونوں انصاریوں نے بتایا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں کچھ انصار سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں اور مشورہ دیا کہ وہاں مت جاؤ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر ڈالو' (یعنی خلیفہ منتخب کر لو)۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''خدا کی قسم ہم ان کے پاس ضرور جائیں گے'' یہ تینوں حضرات وہاں پہنچے تھوڑی دیر بیٹھے تھے کہ غالباً ثابت بن قیسؓ نے تشہد پڑھا اور اللہ کی ثناء بیان کی جیسے کہ اللہ کو سزاوار ہے پھر کہا:

''ہم اللہ کے دین کے مددگار اور اسلام کی فوج ہیں۔اور اے مہاجرین تم تھوڑی سی جماعت ہو۔تم میں سے ایک چھوٹی سی جماعت اپنی قوم (قریش) سے نکل کر ہم میں آ رہی۔اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمیں خلافت سے محروم کر دو۔''

جب ان کی بات ختم ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ان سے مخاطب ہوئے ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا۔

''بھائیو تم نے جو اپنی فضیلت اور بزرگی بیان کی وہ سب درست ہے اور تم بے شک اس کے سزاوار ہو' مگر خلافت قریش کے سوا کسی اور قبیلے کے لیے نہیں ہو سکتی۔کیونکہ اضراہ اور خاندان قریش تمام عرب قبائل سے بڑھ کے ہیں۔اے سعد تم خوب جانتے ہو جو کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا اس وقت تم موجود تھے۔''قریش امر خلافت کے والی ہیں۔ان کے نیک نیکوں کا اور فاجر فاجروں کا اتباع کرتے ہیں۔''

تو سعدؓ نے جواب دیا کہ ''آپ نے سچ کہا ہم وزیر ہوں گے تم امیر۔''ان کے بعد ایک انصاری حضرت بشیر بن سعد خزرجیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پرزور تائید میں یہ الفاظ کہے۔

''ہم نے اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ فقط اطاعت رسول اللہﷺ اور رضائے الٰہی کے لیے تھا۔یہ مناسب نہیں کہ اس کے عوض ہم متاع دنیا کے خواہاں ہوں۔ہمیں اجر دینے والا اللہ ہے۔خلافت کے مستحق تم (انصار) سے زیادہ خود حضورﷺ کی قوم ہے۔''

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا ''میں چاہتا ہوں کہ تم ان دونوں آدمیوں میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو جسے تم چاہو'' پھر انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ ہاتھ تھامے دونوں حضرات نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی موجودگی میں خلافت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا اپنا ہاتھ اُٹھایئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت عمرؓ نے ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی اس طرح بیعت انعقاد خلافت ہو گئی۔اس کے بعد تمام حاضرین مجلس نے بیعت کی۔یہ حضورﷺ کی وفات والے دن' پیر کی ظہر سے پہلے ہوا۔دوسرے دن یعنی منگل کو حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں لوگوں سے خطاب کیا اور اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت بیان کی اور لوگوں سے کہا ان سے بیعت کریں تو عوام الناس (مہاجرین) سب نے ان سے بیعت کی اور اس طرح یہ بیعت عامہ ہوئی۔بخاری شریف میں ہے کہ حضرت علیؓ نے تقریباً تین ماہ بعد مسجد نبوی میں بیعت کی لوگوں کو اس بات کی بہت خوشی ہوئی کہ حضرت علیؓ معروف کی طرف لوٹ آئے ہیں۔اب وہ پہلے سے زیادہ حضرت علیؓ سے محبت کرنے لگے۔

خلیفہ اول کے چناؤ سے جمہوریت ثابت کرنے کی ناکام کوشش

اب سنیئے جمہوریت کے شیدائی لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ بنائے جانے والے واقعہ کو کس طرح تروڑ مروڑ کر اپنی مطلب برآری کے لیے جمہوریت سے ڈانڈے ملاتے ہیں۔

''سقیفہ بنی ساعدہ اس وقت کا پارلیمنٹ ہاؤس (Parliament House) تھا۔مہاجر اور انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں تمام قبائلی سرداروں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کی' جو اپنے قبیلوں کے نمائندے تھے۔لہٰذا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کثرت رائے یعنی جمہوری طریقہ سے خلیفہ بنایا گیا۔''حقیقت یہ ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ محض قبیلہ خزرج کی ایک ذیلی شاخ بنو ساعدہ کے سعد بن عبادہ کا تھا۔اور یہ ڈیرہ یا چھپر یا سائبان انہی کے مکان سے ملحق تھا۔فراغت کے اوقات میں روزمرہ کی عام گفتگو کے لیے چند لوگ جمع ہوتے تھے یہ نہ تو کوئی ایسا مقام تھا جو مدینہ بھر کے معززین کے لیے مخصوص

ہو یا اس جگہ اتنے آدمی اس چھپر کے سائے میں بیٹھ سکیں۔ یہ کوئی انتخابی مرکز بھی نہ تھا کہ کسی کو خیال آتا کہ انتخاب کے لیے یہی جگہ موضوع رہے گی۔ دوسری بات کے حضورﷺ کی موجودگی میں تمام معاملات مسجد نبوی میں طے کیے جاتے تھے۔ آپﷺ کا حجرہ مبارک اور مسجد مسلمانوں کے دل و جان کا محور تھے۔ مزید یہ کہ سقیفہ بنی ساعدہ پر موجود زیادہ تعداد بنوں ساعدہ کے انصار کی تھی اور باقی اڑھائی سو انصار قبیلوں کے لوگ اور سردار موجود نہ تھے۔ مہاجرین میں سے کل چار یا پانچ صحابہ ؓ وہاں موجود تھے۔ جن میں حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کا تعلق قریش کے دس مشہور خاندانوں میں سے نہ تھا۔ یعنی یہاں صرف قریش کے دو قبیلوں کے سردار تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے مسلمانوں کو حضورﷺ کے وصال کی خبر ملتی گئی لوگ اپنے گھروں سے چلنا شروع ہوئے اور تین دن تک آتے رہے۔ اور ٹولیوں کی صورت میں حضورﷺ کی نماز جنازہ ادا کی جاتی رہی۔ تدفین اس لیے روکی گئی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان حضور کا آخری دیدار کر لیں۔

اس وقت کے سرداروں کا چناؤ کسی کثرت رائے سے نہیں ہوتا تھا۔ معاملہ بالکل سادہ اور فطری تھا۔ عام طور پر سرداروں کے چناؤ میں تین باتیں ملحوظ خاطر رکھی جاتی تھیں۔

۱۔ عمر میں بڑا ہونا۔

۲۔ سمجھ دار اور تجربہ کار ہونا۔

۳۔ اپنی اعتقادات اور خصائل کی بنیاد پر محترم ہونا۔

اور ان سرداروں کا چناؤ کسی مخصوص مجلس یا مخصوص وقت میں نہیں ہوتا تھا بلکہ فیصلہ کے لیے چند معزز لوگ نجی گفتگو اور مجلس میں رائے قائم کر لیتے تھے کہ فلاں شخص اس رتبہ کا اہل ہے۔ ایسی چند متفرق اور نجی مجلسوں میں اتفاق رائے کے بعد اسے سردار بنا دیا جاتا۔

حضورﷺ کی وفات کے وقت محتاط اندازے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد تیرہ لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ اگر سرداروں کو نمائندہ مان بھی لیا جائے تو کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان تیرہ لاکھ مسلمانوں کے نمائندوں کو چار گھنٹوں میں اطلاع بھی مل گئی ہوگی اور ان چار گھنٹوں میں مدینہ پہنچ کر سقیفہ بنی ساعدہ کے اجلاس میں شرکت کی ہوگی؟ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے باحیثیت خلیفۃ المسلمین کے چناؤ کو موجودہ نمائندہ پارلیمانی نظام سے جو مماثلت ثابت کی جا رہی ہے وہ ایک کہانی ایلس ان ونڈر لینڈ (Alice in Wonderland) کی طرح ہے کہ

ایلس ایک بچی کسی جگہ سے گزر رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ ایک سانپ انڈے کھا رہا ہے۔ بچی تھی' یہ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا۔ کچھ روز بعد وہ کہیں گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا انڈے کھا رہا تھا۔ ایلس نے اسے کہا ''تم سانپ ہو'' یہ سنتے ہی انڈہ اس بچارے کے گلے میں پھنس گیا۔ آدمی نے پوچھا وہ کیسے؟ ایلس نے جواب دیا۔

Snakes eat eggs, You eat eggs, You are a snake.

''یعنی سانپ انڈے کھاتے ہیں' تم انڈے کھاتے ہو' تم سانپ ہو۔''

ان جمہوری لوگوں کی منطق بھی ایلس کی منطق کی طرح ہے۔ چند گنے چنے صحابہ کرام ؓ (چار یا پانچ) کے اختلاف پر پورا جمہوری نظام چسپاں کر دیا۔ جمہوری نظام کی اپوزیشن پارٹی (Opposition Party) بنا دی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام کو اس بات سے منسوب کرنے والے حضرات' یا ان کا مکتبہ فکر جمہوری نظام کی روح کو نہیں سمجھ سکا۔

پھر غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے لوگوں کی اکثریت کے مطابق فیصلے کیے؟

اس کے جواب میں' دو مشہور واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حضورﷺ کی وفات کے بعد پہلا مسئلہ حضرت اسامہ بن زید ؓ کے لشکر کو بھیجنے کا اور دوسرا زکوٰۃ نہ جمع کرانے والوں کا تھا۔ پہلے مسئلے کے مشورہ میں تمام بزرگ اصحاب کرام کی رائے تھی کو حالات اتنے بدل چکے ہیں' اب اسامہ بن زید ؓ کا لشکر جو حضورﷺ نے روانہ کیا تھا اسے روک لیا جائے۔ طبری نے حضرت ابوبکر ؓ کا فیصلہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں ابوبکر کی جان ہے' اگر مجھے یقین ہو کہ درندے آ کر مجھے اٹھا لے جائیں گے تو بھی اسامہ کا لشکر ضرور بھیجوں گا' جیسا کے حضورﷺ نے حکم دیا تھا اور اگر ان آبادیوں میں میرے سوا کوئی شخص بھی باقی نہ رہے تو بھی میں یہ لشکر روانہ کروں گا۔''

چنانچہ لشکر بھیجا گیا جو سرخرو ہو کر آیا۔ اس فیصلے کی یہ برکت ہوئی کہ یہ لشکر دیکھ کر اہل عرب کے دلوں میں رعب بیٹھ گیا کہ یقیناً مسلمانوں کے پاس اتنی زیادہ فوج ہوگی تو انہوں نے ان حالات میں بھی لشکر باہر بھیجا۔

دوسرا معاملہ یعنی زکوٰۃ کا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے مسجد نبوی میں مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور فرمایا کہ ''عرب نے زکوٰۃ جمع کرانی چھوڑ دی ہے مجھے مشورہ دیں کہ مجھے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔''

حضرت عمر فاروق ؓ نے فرمایا آپ ان لوگوں سے کیسے لڑیں گے یہ کلمہ پڑھتے ہیں اور یہ کہ اس وقت ہم مہاجرین و انصار میں تمام عرب و عجم کے مقابلے کی سکت ہی نہیں۔ اس کے بعد حضرت عثمان ؓ' حضرت علی ؓ نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ اس کے بعد موجود مہاجرین و انصار بھی اس رائے کی تائید میں یک زباں ہو گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت عمر فاروق ؓ سے وہ تاریخی الفاظ کہے جو کنز میں نقل کیے گئے ہیں۔ 'کفر کی حالت میں دلیر اور اسلام کی حالت میں بزدل'۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا:

''خدا کی قسم میں برابر امر الٰہی پر قائم رہوں گا' اور خدا کی راہ میں جہاد کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما دیں۔ اور ہم میں سے جو قتل ہو وہ شہید ہو کر جنت میں جائے اور جو زندہ رہے وہ خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے بندوں کا وارث ہو کر رہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ خدا کی قسم میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا۔ یہ لوگ جو زکوٰۃ حضورﷺ کی حیات طیبہ میں ادا کرتے تھے اس میں سے ایک رسی بھی روکیں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا حتیٰ کہ میری روح اللہ تعالیٰ سے جا ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا' بلکہ دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔''

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر ؓ نے کہا ''خدا کی قسم اس کے بعد میں سمجھ گیا کہ ابوبکر صدیق ؓ کے دل میں جولڑائی کا ارادہ ہوا ہے یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا ہے اور میں پہچان گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی رائے حق ہے' چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ زکوٰۃ سے انکاری لوگوں کے خلاف جہاد کا عزم مصمم کر کے نکل کھڑے ہوئے اور جب وہ مقام ذی القصہ تک پہنچے تو حضرت علی ؓ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ تھام لی' ۔کنز میں نقل ہے کہ انہوں نے فرمایا ''اے خلیفہ رسول آج میں آپ سے وہی بات کہتا ہوں جو آپ نے غزوہ اُحد کے دن رسول اللہ ﷺ کو کہی تھی ۔یعنی

''اپنی تلوار کو میان میں کیجیے اور ہمیں اپنی ہستی سے محروم نہ کیجیے ۔خدا کی قسم اگر آپ کے قتل کی مصیبت ہم پر پڑ گئی تو پھر آپ کے بعد اسلام کا نظام کبھی درست نہیں ہوگا''

حضرت علی ؓ کے اصرار پر حضرت ابوبکر ؓ خود تو واپس مدینہ تشریف لائے ۔اپنی جگہ حضرت خالد بن ولید کو سپہ سالار بنایا اور باغیوں اور مرتدین کے خلاف جہاد کیا ۔اب آپ خود ہی دیکھیں کہ یہاں تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے تمام شوریٰ اور تمام اصحاب اکرام ؓ' بڑے بڑے اکابرین کی رائے کے خلاف دوٹوک اور قطعی فیصلے کیے ۔خلیفہ وقت نے تمام شوریٰ کی متفقہ رائے کو نا قابل تسلیم قرار دے کر اپنی رائے کے مطابق فیصلے کیے ۔پھر سب نے اطاعت کی اور بعد میں سب نے اعتراف بھی کیا کہ واقع اکیلے خلیفہ کی رائے ہی امر بالحق تھی ۔

عربوں کی یہ خاصیت تھی کہ وہ دلیر اور صاف گو لوگ تھے کھری کھری اور سچی بات کرنا ان کا شیوہ تھا ۔لیکن حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے فیصلے سن کر ایک شخص نہ اُٹھا کہ آپ نے اکثریت کو کیسے رد کر دیا ۔اگر حضرت عمر ؓ جیسے خلیفہ سے جنہیں دیکھ کر شیطان بھی راہ بدل لیتا تھا' ایک آدمی ان کی قمیض کے کپڑے کے بارے میں پوچھ سکتا تھا تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے ایسے سوال اور اعتراض کیے جا سکتے تھے لیکن یہاں کیا' آپ کو پوری خلفا راشدین کی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملے گا' کسی کی اکثریت کی بات یا اکثریت کے حق ہونے کی بات نہیں ملے گی ۔بعد کی تاریخ میں مسلمانوں نے خلیفہ کے خلاف جہاد تو کیا لیکن اکثریت کے حق ہونے کے لیے نہیں' جمہوریت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ خلافت راشدہ کے بعد خلاف دین احکام جاری ہونے لگے تھے ۔ایسا ایک واقعہ 120 ہجری میں ہوا ۔خطابات بہاولپور میں پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام حسین ؓ کے پڑپوتے زین بن زین العابدین کو حکومت کے مظالم کی وجہ سے حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی اور وہ حکومت وقت کے دین سے انحراف کرنے پر ان کے خلاف ہو گئے ۔امام ابوحنیفہ ؒ انہیں بہت چاہتے تھے اور وہ دل سے خواہاں تھے کہ بنوامیہ کے حکمرانوں کی جگہ زین بن زین العابدین خلیفہ بن جائیں ۔ایک دن زین بن زین العابدین نے ان سے کہا کہ بہت سے لوگ مجھے مدد دینے پر آمادہ ہو چکے ہیں' میں اب حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرنا چاہتا ہوں ۔امام ابوحنیفہ ؒ نے ان کو رقم دی لیکن ساتھ دینے سے انکار کر دیا' یہ کہتے ہوئے کہ ''اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تمہارے تمام ساتھی تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں گے تو میں بھی اسی فوج میں شریک ہوتا' یعنی حکومت کے خلاف بغاوت میں خود حصہ لیتا مگر مجھے اطمینان نہیں ہے ۔میں آپ کو رقم کی حد تک مدد دیتا ہوں'' چنانچہ وہی ہوا جس کا امام ابوحنیفہ ؒ کو اندیشہ تھا یعنی ان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے حکومت نے ان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا ۔

عوام کی اکثریت کی بات نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں کہیں لفظ 'جمہور' نہیں ملتا ۔'جمہور' سے مراد ہے عوام ۔یہ لفظ 'جمہور' حدیث میں بھی نہیں ملتا لیکن ایک گروہ کا کہنا ہے کہ خلفائے راشدین کا دور جمہوری تھا بلکہ کچھ تو یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ مغرب والوں نے جمہوریت اسلام سے چرائی ہے ۔

دراصل جب عوام کی بات ہوگی تو جغرافیائی قومیت (Nationalism) بھی ساتھ ہوگی کیونکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں ۔اللہ تعالیٰ وہ ذات نہیں کہ وہ انسان کو قومیت (Nationalism) کا نظریہ دے یا ایسا نظریہ دے جو دائمی نہ ہو ۔جغرافیائی قومیت (Nationalism) صرف ماڈرن دور کا نظریہ ہے اس کے بارے میں یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کب تک رہے گا ۔اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا نظریہ نہیں دیا جس سے قوموں میں خون خرابہ ہو ۔حضرت نوحؑ کے دور سے اب تک کفار نے جتنی بھی جنگیں لڑی ہیں ۔یہاں تک کہ موجودہ دور کی ورلڈ وارز (World Wars) یہ انہی کے بنائے اپنے نظریات اور عقیدوں کی وجہ سے لڑی گئی ہیں ۔یہ سب انسان کا اپنا کیا دھرا ہے ۔اللہ تعالیٰ نے صرف ملت اسلامی قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا' اے انسانوں سب مسلمان ہو جاؤ ۔پھر تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے اور جب پھر بھی قومیں کفر پر قائم رہیں تو جن پیغمبروں کی دعوت وتبلیغ سے کچھ مسلمان ہوئے ان کو حکم ہوا کہ کفار کے خلاف جہاد کرو' جیسے حضرت سلیمان ؑ حضرت ذوالقرنینؑ اور حضرت موسیٰؑ کی قوموں کو جہاد کا حکم دیا گیا اور پھر پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی امت وملتِ واحد بنا کر جہاد کا حکم دیا ۔اللہ نے کائنات بناتے وقت ہر چیز کے جوڑے بنائے' خواہ تماثیل کی حیثیت جیسے یکساں رنگ اور مزے دار پھل اور ایک شکل وصورت کے دو جانور یا تقابل کی حیثیت سے جیسے عورت' مرد' نر و مادہ' میٹھا کڑوا' سفید و سیاہ' دن رات' اندھیرا اجالا اسی طرح انسانوں میں بھی دو گروہ حزب اللہ اور حزب شیطان وجود میں آئے یعنی مسلمان اور کفار ۔جب تک مسلمانوں نے کفار سے جہاد کیا تینوں براعظموں میں متواتر بڑھتے چلے گئے ۔سپین کے بعد آٹھویں صدی عیسوی میں فرانس کے علاقہ میں داخل ہوئے ۔تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان پیرس سے صرف سو میل دور رہ گئے تھے انہیں یہاں پر ایک جنگی حکمت عملی غلط قیاس اور تعداد کی کمی کی وجہ سے فرینکس (Francs) سے شکست ہوگئی ۔پھر کچھ صدیوں میں آسٹریا کے شہر ویانا (Vienna) پر قبضہ کرنے کی کوشش کی یعنی ویانا (Vienna) کے لیے دو دفعہ جنگ ہوئی ۔ترک اس جنگ میں مصروف تھے کہ ایک دوسرے محاذ پر ایک مسلمان حکومت نے ترکوں پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ترکوں کو ویانا (Vienna) سے افواج واپس بلانا پڑیں ۔اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا تو شاید آسٹریا (Austria) بھی خلافت عثمانیہ کا حصہ بن جاتا ۔**ہمارے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کی تین وجوہات تھیں' پہلی اور سب سے اہم وجہ جہاد کا ترک کرنا ۔دوسری وجہ علماء سو کا وجود میں آنا جنہوں نے ناحق پر بھی مسلمان حکمرانوں کی تائید کی یعنی ساتھ دیا ۔اور تیسری وجہ مسلمانوں کا آرام پرست ہونا ۔**

اقبال کی زبان میں:

تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں ۔۔۔ ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل ۔۔۔ کہتا ہے کون اسے کہ مسلمان کی موت مر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات ۔۔۔ اسلام کا محاسبہ' یورپ سے درگزر

پھر یہ کہ:

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی ۔۔۔ اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اور آرام پرستی کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ　　بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

مردِ مسلمان کے بارے میں اقبال کے مشہور اشعار یاد آ گئے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یہ ہمیں معلوم ہے کہ جب خلافت پوری طاقت میں تھی یورپ جہالت (Dark Ages) کے دور سے گزر رہا تھا۔ ٹائن بی (Toynbee) لکھتا ہے کہ ''مسلمان علم وفن میں بہت آگے تھے۔ یہاں تک کہ سقراط' ارسطو اور بقراط کے تمام فلسفے مغربی دنیا کو مسلمانوں سے عربی زبان میں ملے۔'' جہاد کی وجہ سے مسلمان ٹیکنالوجی (Technology) میں باقی تہذیبوں سے آگے رہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام ایجادات کا پہلا استعمال جنگ میں ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ ریڈیو ہو' ہوائی جہاز ہو یا نیوکلیئر ٹیکنالوجی۔ اگر مسلمان جہاد جاری رکھتے تو وہ ٹیکنالوجی میں بھی سب سے آگے رہتے اور شاید یورپ اور چین کا تمام علاقہ مسلمان ہو چکا ہوتا۔ تینوں براعظموں کے لوگ ملت واحدہ کی صورت اختیار کر لیتے جو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور منشا ہے۔ مغربی تہذیب جنگوں کا شکار نہ ہوتی' نہ یہ چھوٹے موٹے ملک' نہ کفار اقوام کا نظریہ جمہوریت اور نہ ہی قومیت (Nationalism) کے بت۔ انسان کی یہ تمام قومیتیں (Parochialism) اور (Nationalism) اس کے کفر کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں' ورنہ خلیفہ ایک ہوتا ہے اور تمام مسلمان اس کی بیعت کرتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت کا نظریہ یورپ میں اس لیے وجود میں آیا کہ مسلمانوں نے جہاد ترک کر دیا ہم نے انہیں اسلام کا درس دینا چھوڑ دیا انہوں نے ہمیں کفر کا درس شروع کر دیا۔ گنگا الٹی بہنے لگی۔ مختصر یہ کہ اکثریت کی حاکمیت کا نظریہ جمہوریت' قرآن اور حدیث سے نکالنا اور مسلمانوں کی تاریخ میں تلاش کرنا بالکل بے سود ہے۔ ہاں خلافت عثمانیہ کے بعد جب 1924ء میں۔

''چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا''

اور مسلمانوں میں جمہوری نظریہ نظر آنے لگا۔

یہ قابل غور ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ قرآن میں کہہ دیتے یا رسول کریم ﷺ کہیں فرما دیتے کہ:

''اپنے معاملات اکثریت کی رائے کے مطابق طے کر لیا کرو' تو انسان کو اپنی من مانی کرنے کا دروازہ کھل جاتا۔ اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آشیر باد مل جاتی' بلکہ ایک لائسنس مل جاتا' من مانی کرنے کا' ہوس پرستی کا۔ حلال حرام اور حق اور سچ کا معیار اکثریت کی رائے بن جاتی۔ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا کہ تم نے یہ کام کیوں کیے؟ تو وہ کہتا ''یا اللہ تو نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ اپنے معاملات اکثریت کی رائے کے مطابق طے کر لیا کرو۔ ہم نے جو کیا تیرے حکم اور تیری اجازت سے کیا۔''

اب آپ خود بتائیے کہ جہنم کی کیا ضرورت رہ گئی۔ سود' زنا' شراب' لواطت سب جائز ہو چکے ہوں تو قرآن مجید کی کیا حقیت باقی رہ جاتی ہے۔ جہاد ختم ہو جاتا کیونکہ سب کو حق حاصل ہوتا کہ وہ اکثریت کی رائے کے مطابق جو چاہیں کریں۔ جمہوریت کو جائز مانا جائے تو قرآن اور جہاد حق نہیں مانے جا سکتے۔ جمہوریت تو انتہائے کفر ہے اور تدریجاً کفر میں ترقی کرتے یہ منتہائے کفر ہے۔ جب اکثریت جو کہے' کرے وہ صحیح مانا جائے تو تمام پیغمبروں کا آنا بے معنی اور بے مقصد ہو جاتا ہے۔ فرد واحد تمام اکثریتوں کی نظریات واعمال ٹھیک کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ اس سے بھی آگے پیغمبروں کی نافرمانی کی وجہ سے قوموں پر جو اکثریت میں ہوا کرتی تھیں اللہ تعالیٰ کا عذاب معاذ اللہ ان قوموں پر ظلم اور ناانصافی بن جاتا ہے۔ یعنی نعوذ باللہ' اللہ تعالیٰ بے عیب نہیں' اب بتائیں ایسے نظریے کو صحیح کہنے والا محض جہالت کی وجہ سے کتنی بڑی اور سنگین بات کہہ جاتا ہے۔

خلیفۂ دوئم حضرت عمر فاروق h کی نامزدگی (Selection)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کس طرح خلیفہ بنائے گئے اور انہوں نے اپنے فیصلے کس طرح کیے۔

ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اپنی مرض الموت میں حضرت عمر بن خطابؓ کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ تاریخ میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بلایا اور کہا' عمرؓ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے' حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا۔

''اے خلیفہ رسول ﷺ عمر آپؓ کی رائے میں زیادہ بہتر ہے۔ مگر مزاج میں سختی ہے۔'' حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا۔ ''وہ اس لیے تھی کہ میں نرم تھا۔ جب خلافت کا بوجھ سر پر پڑے گا تو سب سختیاں دور ہو جائیں گی۔''

اس کے بعد انہوں نے حضرت عثمان بن عفان ؓ کو بلوایا اور پوچھا ''عمرؓ کے بارے میں کیا رائے ہے حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ''میرے علم کے مطابق ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ہم لوگوں میں ان کا کوئی جواب نہیں۔'' حضرت عمرؓ کی سخت طبیعت کی وجہ سے حضرت طلحہؓ نے کہا ''اب آپؓ خدا کے پاس جاتے ہیں۔ یہ سوچ لیں کہ خدا کو کیا جواب دیں گے'' حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ''میں خدا سے کہوں گا کہ میں نے تیرے بندوں پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا ہے جو سب سے بہتر تھا۔'' ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت علیؓ کو بلا کر پوچھا اور انہوں نے بھی وہی کہا جو حضرت عثمان ؓ نے فرمایا تھا۔

پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ کو بلوا کر حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد نامہ لکھوایا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے بالا خانے پر چڑھے اور لوگوں سے کہا کہ میں نے عمر بن خطاب ؓ کو تم پر خلیفہ مقرر کیا ہے تم اسی کی سنو اور اطاعت کرو' اس پر لوگوں نے کہا کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' اس سے پہلے کہ ہم اس واقعہ کا تجزیہ کریں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں جو انعمت علیہم' میں شامل ہیں اور جنہیں حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دی تھی۔

اس تمام واقعہ سے بھی جمہوریت کا نشان نہیں ملتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ تقریباً 3 ماہ بیمار رہے۔ وہ چاہتے تو مکہ مدینہ اور طائف کے شہروں میں بسنے والے لوگوں سے ان کی رائے طلب کر سکتے تھے کہ لوگ کس کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں تاہم انہوں نے ایسا نہیں کیا اگر تمام لوگوں سے رائے لینا ان کی نظر میں مناسب نہیں تھا تو کم از کم اتنا تو کر سکتے تھے کہ تمام قبائل کے سرداروں اور گورنروں کو بلواتے اور ان کی

اکثریت کی رائے پر فیصلہ فرما دیتے' یہ بھی نہیں ہوا۔ یہ تو ہوسکتا تھا کہ کسی بھی نماز کے بعد وہ تمام موجود نمازیوں سے ان کی رائے لیتے اور خلیفہ مقرر کر دیتے۔ یہ بھی نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خود ذہن بنایا۔ چند اکابرین صحابیان سے مشورہ کیا۔ پھر فیصلہ لکھوا دیا اور لوگوں میں اعلان کر دیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جن صحابہ سے مشورہ کیا سب نے حضرت عمر کے مزاج کی سختی کا ذکر کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے مقرر کرنے سے حضرت عمرؓ کی خلافت منعقد ہوگئی اور سب مسلمانوں نے یک زبان ہو کر کہا' ہم سنیں گے مانیں گے۔ بعد میں سب نے بیعت کر لی۔ یہ بیعت اطاعت تھی۔ تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ فیصلہ نہ صرف صحیح تھا بلکہ وہ امت مسلمہ پر احسان کر گئے۔ آج دنیا ایک ایک چیز میں حضرت عمرؓ کی مثال دیتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک انگریز مورخ غالباً کارلائل نے کہا اگر عمرؓ 10 سال اور زندہ رہ جاتا تو خلافت ساری دنیا پر پھیل جاتی سوچنے کی بات ہے کہ اسلام کے نظام کو وہ حضرات زیادہ بہتر جانتے تھے نہ کہ ہم جو جمہوریت اسلام میں ٹھونس رہے ہیں۔ اب یہ جائزہ لیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے فیصلے کیسے فرمایا کرتے تھے۔ یہ واقعہ جناب عبدالرحمٰن کیلانی نے اپنی کتاب' خلافت اور جمہوریت' میں طبری جلد 3 سے ماخوذ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عراق پر حملہ کے لیے حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنا کر خود فوج کی کمان سنبھال لی اور فوج لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ہم لوگ کتنے ظالم ہیں' اپنی تنگ نظری اور میلے دلوں پر صحابہ کرامؓ کے اختلاف کا قیاس کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ خلیفہ بننے کے بعد پہلی مرتبہ مدینہ چھوڑ رہے ہیں اور اپنا قائم مقام حضرت علیؓ کو بنا رہے ہیں۔ مگر افسوس ہماری بے لگام زبانیں کہیں نہیں رکتیں۔ ایک جگہ چشمہ سراء پر آ کر قیام کیا۔ تمام فوج میں لڑائی کے لیے جوش پیدا ہو گیا کیونکہ خلیفہ وقت خود ان کا سپہ سالار تھا۔ حضرت عثمان نے فاروق اعظمؓ کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ کا خود عراق جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے تمام سپہ سالاران فوج اور تمام لشکری لوگوں کو ایک جلسہ عظیم میں مخاطب کر کے خطاب کیا۔ تمام فوج ان کے ساتھ ہونے پر بہت خوش تھی۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا کہ میں اس رائے کو نہ پسند کرتا ہوں۔ خلیفہ وقت کا خود مدینہ منورہ سے جانا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر کسی سردار کو جنگ میں حزیمت ہو تو خلیفہ وقت کام کو سنبھال لے گا۔ لیکن اگر خلیفہ وقت کو جنگ میں کوئی نقصان پہنچے تو پھر مسلمانوں کے کام کو سنبھالنا دشوار ہو جائے گا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کو مدینہ سے بلوایا اور تمام اکابر صحابہ کرامؓ کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ وقت ساتھ نہ جائیں۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے تمام فوج سے پھر خطاب کیا کہ تمام صاحب الرائے حضرات میرے جانے کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں مجبور ہوں اب کوئی دوسرا شخص سپہ سالار بن کر تمہارے ساتھ جائے گا۔ اس کے بعد حضرت سعد بن وقاصؓ کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اکثریت کی رائے کو رد کر کے چند اہل رائے کے مشورہ کو قبول کیا۔ دوسری بات کہ حضرت عمرؓ جانے کا فیصلہ کرنے کے بعد کچھ سفر بھی طے کر چکے تھے اور فوج کے تمام لوگ ان کے اس فیصلے سے خوش تھے اور اس کے حق میں تھے۔ اس کے باوجود چند اہل اصحابؓ نے اس فیصلہ پر اعتراض کرنے پر کوئی تغافل نہیں کیا۔ ہم اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بہت جوش' شوق اور ولولے سے قیادت میں نکلے ہوں گے کیونکہ وہ اکثر دعا فرمایا کرتے تھے کہ یا اللہ مجھے شہادت کی موت عطا فرما اس کے باوجود انہوں نے اہل عقل و دانش کا فیصلہ قبول کیا اللہ نے ان کی دعا کسی اور طریقے سے قبول فرمائی اس واقع سے بھی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلے کرنے کی نفی ہوتی ہے اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ رائے کو Opinion اور Recommendation کہا جاتا ہے فیصلہ نہیں۔ رائے فیصلہ ہوتی تو پوری فوج کے فیصلہ کو ماننا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس ووٹ فیصلہ ہوتا ہے' رائے یا مشورہ نہیں۔

ایسے ہی اور واقعات ہیں۔ مثال کے طور پر طاعون سے متعلق حضرت عمرؓ کی مشاورت کا اور عراق کے مفتوح علاقوں کی زمینوں کو سرکاری ملکیت میں لینے کا جہاں حضرت عمرؓ نے تمام لوگوں کی رائے اور مشورے کے خلاف فیصلے کیے۔ حضرت عمرؓ ایسا بھی کرتے تھے کہ نماز کے اوقات میں مسجد نبوی میں لوگوں سے رائے طلب کرتے اور اجماع صحابہؓ کے ساتھ فیصلہ فرماتے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ اجماع صحابہ اور اکثریت کی رائے بالکل مختلف چیزیں ہیں۔

خلیفہ سوئم حضرت عثمان بن غفانؓ کی تقرری

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا چناؤ کیسے ہوا۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو ان سے کہا گیا کہ آپ کسی کو خلیفہ بنا دیجئے۔ فرمایا ''اگر خلیفہ مقرر کر دوں' تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ مقرر کر گئے تھے اور اگر نہ کروں تو (بھی ٹھیک ہے کیونکہ) حضور اکرم ﷺ جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ نہیں بنا گئے تھے۔'' طبری میں ہے کہ جب حضرت عمر پر خنجر کا وار ہوا تو آپ سے کہا گیا کہ کسی کو خلیفہ بنا جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ابوعبیدہ بن جراحؓ زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا۔

پھر کسی نے کہا کہ اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کو نامزد کر جائیے۔ آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور یہ بھی کہا کہ ''اگر یہ حکومت اچھی چیز تھی تو اس کا مزہ ہم نے چکھ لیا۔ اگر یہ بری چیز تھی تو عمر کے خاندان کے لیے یہی کافی ہے کہ کل خدا کے سامنے ان میں سے ایک ہی آدمی سے حساب لیا جائے۔'' (طبری)

بعد ازاں بخاری میں ہے کہ انہوں نے چھ اصحاب کرامؓ کی شوریٰ بنائی وہ چھ اصحاب اکرامؓ یہ تھے۔ حضرت علیؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت طلحہؓ' حضرت سعد بن ابووقاصؓ' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ فرمایا کہ یہ آپس میں مشورہ سے اپنے میں سے خلیفہ کا تقرر کر لیں۔ پھر حضرت عمر فاروقؓ وفات پا گئے۔ ان کی تدفین سے فراغت کے بعد یہ چھ اصحاب اکٹھے ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ چھ اپنے میں سے تین کو مختار کر لو۔ چنانچہ حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کے حق میں حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ وہ خلیفہ بننے کی خواہش نہیں رکھتے اس لیے اگر تم دونوں چاہو تو میں تم دونوں میں سے ایک خلیفہ مقرر کر دوں۔ دونوں نے کہا ہمیں قبول ہے۔ آپ خود سوچئے نہ حضرت علیؓ نے' نہ حضرت عثمانؓ نے بلکہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ کو عوام کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے یا آپ کو تمام مسلمانوں سے مشورہ کرنا چاہئے اور جسے وہ چنیں اسے خلیفہ مقرر کریں۔ اگر حضور کریم ﷺ کا کوئی ایسا فرمان ہوتا جس میں عوام سے تمام مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی گنجائش ہوتی تو پوری خلفائے راشدینؓ کی تاریخ میں کوئی ایک صحابی تو اس کا ذکر کرتا۔ مگر کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ایک صحابیؓ نے بھی یہ کہا ہو کہ عوام سے مشورہ لیا جائے اور جس کی طرف زیادہ مسلمان ہوں اس کو خلیفہ بنایا جائے یا کبھی یہ کہا ہو کہ اسلام میں حلال عمل کے لئے اپنا ایجنٹ' نمائندہ یا وکیل چننے کی اجازت ہے اس لئے ووٹ ڈلوا لو کہ عوام کس کو اپنا خلیفہ چنتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ راوی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''فقہا' عابدین' سمجھ دار خدا پرستوں سے مشورہ کرو اور کسی اکے دکے کی رائے مت جاری کرو۔'' (تفسیر عثمانی)

یہاں پر ایک اور بات عرض کرتا چلوں کہ 'انسان اپنا ایجنٹ' نمائندہ یا وکیل اس وقت چنتا ہے جب اس کا حق ثابت ہو' شادی بیاہ' مکان' پلاٹ خرید و فروخت میں۔ یا حق حاصل کرنا ہو جیسا کہ مقدمہ وغیرہ میں' جب کہ قرآن' حدیث یا صحابہ کرامؓ کے کسی کلام یا عمل سے ثابت ہی نہیں ہوتا کہ ہر' اکے دکے' کو خلیفہ چننے کا حق دے دیا گیا ہے۔ خلیفہ چننے کا معاملہ بہت اہم اور سنگین دینی معاملہ ہے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ چور' ڈاکو' شرابی' زانی' رشوت خور' ناجائز منافع خور' رسہ گیر اپنے ہی جیسے کو نمائندہ چنے گا' شریعت تو ایسے لوگوں کی گواہی بھی قبول نہیں کرتی۔ حجۃ الوداع میں حضور ﷺ کے ساتھ ایک لاکھ صحابہؓ تھے۔

حضرت عمرؓ 5000 '500 '100 '50 یا 25 صحابہؓ کی شوریٰ بھی بنا سکتے تھے۔لیکن حضرت عمرؓ نے جو چھ صحابہؓ کی شوریٰ بنائی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو مشورہ میں شامل کیا ہم سب جانتے ہیں کہ سوائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ سب صحابہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ چنانچہ دونوں کی رضامندی سے اور باقی اصحابؓ سے مشورہ کر کے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت انعقادِ خلافت ہوگی۔ پھر بیعت عامہ ہوئی جس میں سب سے پہلے حضرت علیؓ نے بیعت کی اس کے بعد تمام مدینہ میں رہنے والوں نے بیعت کی۔خلیفہ کے انتخاب کے لیے حضرت عمرؓ نے تین دن کی مدت مقرر کی تھی۔حضرت مقداد کو حکم دیا گیا تھا کہ جب تک یہ لوگ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ نہ چن لیں کسی کو اندر آنے یا جانے کی اجازت نہ دی جائے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو صرف رائے دینے کی حد تک نامزد شوریٰ میں شامل ہونے کی اجازت تھی۔صرف یہی ان کے کمرے میں داخل ہو سکتے تھے۔حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق حضرت صہیبؓ کو تین دن کے لیے عارضی طور پر تا انتخاب خلیفہ مدینہ کا امام مقرر کیا۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی تقرری

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کیسے خلیفہ مقرر کیے گئے۔طبری میں ہے کہ عثمانؓ کی شہادت کے بعد پانچ دن تک غافقی بن حرب امارات کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ یہ لوگ شر پسند اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ جو بھی امارت قبول کرے اس کو امیر بنا دیا جائے۔وہ حضرت سعد کے پاس گئے انہوں نے انکار کر دیا۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس گئے انہوں نے بھی انکار کر دیا۔حضرت علیؓ نے بھی برأت کا اعلان کیا۔اس طرح حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے دوٹوک الفاظ میں خلیفہ بننے سے انکار کر دیا۔ان لوگوں نے مدینہ کو محاصرے میں لے لیا کیونکہ اصحاب رسولؐ کی بڑی تعداد حج پر گئی ہوئی تھی اور لوگوں سے کہا کہ ہم تمہیں دو دن کے لیے مہلت دیتے ہیں اس دوران کوئی امیر مقرر کرو ورنہ اگلے دن ہم علیؓ ' طلحہؓ' زبیرؓ سمیت اور بہت سے لوگوں کو قتل کر دیں گے پس لوگ حضرت علیؓ کے گرد ہو گئے' ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں کہ آپ پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔انہوں نے جواب دیا' مجھے چھوڑ دو کسی اور کو تلاش کرو۔

شر پسند عناصر نے شہر کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی جو تھوڑے اصحابؓ رسول مدینہ میں موجود تھے وہ دل شکستہ ہو کر سہمے ہوئے تھے۔ یہ شر پسند جو مصر کوفہ اور بصرہ سے آئے ہوئے تھے انہیں خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر وہ اس معاملے کو یونہی چھوڑ کر واپس چلے گئے تو ان کی خیر نہیں۔

البدایہ میں ہے کہ عبداللہ بن صباح مصر سے بھیس بدل کر مدینہ آیا اور اپنے چیلوں کو تاکید کی کہ خلیفہ کے تقرر کیے بغیر اپنے علاقوں کو ہرگز نہ جائیں۔لوگ پھر حضرت علیؓ کے پاس گئے اور خلافت قبول کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ ہم آپ سے زیادہ کوئی آدمی مناسب نہیں دیکھتے مسابقت فی اسلام اور حضورﷺ کی قرابت کی وجہ سے بھی۔حضرت علیؓ نے کہا ایسا نہ کرو میں امیر بننے سے زیادہ وزیر بننا پسند کرتا ہوں۔لوگوں نے کہا خدا کی قسم ہم تو آپ کی بیعت کریں گے۔ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا یہ اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔ جسے وہ منتخب کریں وہی خلیفہ ہوگا۔پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔دوسرے الفاظ میں خلیفہ بنانے کا حق اہل حل وعقد یا اعیانِ ملت کا ہے۔لیکن اس کا موقع ہی نہ ملا۔اور ایک شخص اشتر نخعی نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور بیعت کر لی۔

حضرت حسنؓ کی تقرری

آخر میں حضرت حسن کا خلیفہ مقرر ہونا۔البدایہ میں ہے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے قریب آپ سے لوگوں نے کہا کہ اپنا ولی عہد مقرر کر جایئے۔آپ نے جواب میں فرمایا میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑوں گا جس طرح حضورﷺ نے مسلمانوں کو چھوڑا تھا۔

حضرت حذب بن عبداللہؓ نے کہا اے امیر المومنین اگر آپ فوت ہو جائیں تو ہم حضرت حسنؓ کے ہاتھ بیعت کر لیں فرمایا ''میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں تم خود بہتر سمجھتے ہو۔'' حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد طبری میں ہے کہ قیس بن سعد نے حضرت حسنؓ سے کہا' اپنا ہاتھ اٹھایئے میں آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبیﷺ کی سنت پر بیعت کرتا ہوں ان کے بعد سب نے بیعت کر لی۔

یہ کہنا کہ اُمت ہی خلیفہ کا بالواسطہ یا براہ راست چناؤ کرتی ہے' نہ دینی طور پر درست ہے نہ تاریخی طور پر۔اور یہ کہنا کہ 'منتخب ہونے والا اُمیدوار' اُمت کی بیعت کے ذریعے خلافت کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے' تاریخ سے ناواقفیت اور دینی کم فہمی کا ثبوت ہے۔پھر یہ کہنا کہ ''اُمت کی بیعت کے ذریعے خلیفہ کے چناؤ پر صحابہ اکرام کا اجماع ہے'' 'سفید جھوٹ' ہے۔خلافت راشدہ سے مکمل ناواقفیت اور حقیقت میں صحابہ کرام ؓ پر بہتان ہے کہ انہوں نے یہ خلاف قرآن' خلاف سنت کام کیا۔ یہ سب مسلمانوں کے علم میں ہونا چاہئے کہ بیعت انعقاد خلافت میں 'اکے دکے' کا کوئی کام نہیں یہ اہل حل وعقد کا فریضہ ہے۔بیعت عامہ جو تمام مسلمانوں نے خلفائے راشدینؓ کی حضور کریمﷺ کے حکم کے مطابق کی' بیعت اطاعت تھی کہ ہم خلیفہ کی اطاعت کریں گے۔